ماہنامہ

اشراق

لاہور

دسمبر ۲۰۱۵ء

زیرسرپرستی

جاوید احمد غامدی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

”... کسی جگہ سے نکلتے ہوئے اُس کی طرف مڑ مڑ کے دیکھنا اِس بات کی علامت ہے کہ اُس کے ساتھ اُنس اور لگاؤ ہے۔ یہ اُنس اور لگاؤ عام حالات میں تو ایک فطری چیز ہے اور ایک فطری تقاضے کو روکا یا دبایا نہیں جا سکتا، لیکن جس بستی کے لیے اتمام حجت کے بعد عذاب الٰہی کا فیصلہ ہو چکا ہو، اُس سے نکلتے وقت اہل ایمان کو اِس طرح دامن جھاڑ کے اٹھنا چاہیے کہ اُس کے ساتھ دل کے لگاؤ کا کوئی شائبہ بھی باقی نہ رہ جائے۔“

——— قرآنیات

المورد

فہرست

اس شمارے میں

اس شمارے میں	نعیم احمد	۴

قرآنیات

البیان: الحجر۱۵: ۴۹-۷۷ (۳)	جاوید احمد غامدی	۵

معارف نبوی

اچھائی کی دعوت کا اجر	معز امجد / شاہد رضا	۱۱

سیر و سوانح

حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ	محمد وسیم اختر مفتی	۱۷

نقطۂ نظر

تعدد ازواج کی آیت کا مطالعہ (۲)	رضوان اللہ	۲۵
کیا مغرب مسلمانوں کے لیے دار الحرب ہے؟	ڈاکٹر خالد ظہیر / رانا معظم صفدر	۳۲

یسئلون

شوریٰ سے متعلق دو اہم سوال	امین احسن اصلاحی	۳۵

ادبیات

غزل	جاوید احمد غامدی	۴۲

اشاریہ

اشاریہ ماہنامہ ''اشراق'' ۲۰۱۵ء	نعیم احمد	۴۴

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نعیم احمد

''قرآنیات'' میں جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا ترجمۂ قرآن ''البیان'' شامل اشاعت ہے۔ یہ قسط سورۂ حجر (۱۵) کی آیات ۴۹-۷۷ کے ترجمہ اور حواشی پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں بتایا ہے کہ خدا غفور و رحیم ہونے کے ساتھ بڑا منتقم و قہار بھی ہے۔ قریش کے ان مغروروں کے مطالبہ پر ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ فرشتوں کا آنا کوئی معمولی بات نہیں، وہ جب آتے ہیں تو کسی مہم ہی پر آتے ہیں۔ انھیں اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے قوم لوط کی سرگذشت سنائی گئی ہے۔

''معارف نبوی'' کے تحت شاہد رضا صاحب کے مضمون ''اچھائی کی دعوت کا اجر'' میں ذکر ہے کہ جس شخص نے ہدایت کی طرف دعوت دی، اس کے لیے ان لوگوں کے اجر کے برابر اجر ہے جو اس دعوت پر عمل پیرا ہوں گے اور جس شخص نے کسی گمراہی کی طرف راغب کیا، اس پر ان لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے۔ یہ معز امجد صاحب کے ایک انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ ہے۔

''سیر و سوانح'' کے تحت محمد وسیم اختر مفتی صاحب کے مضمون میں جلیل القدر صحابی حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کے سبقت اسلام، غزوۂ طائف و یرموک میں ان کی شرکت اور ان کے حالات زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔

''نقطۂ نظر'' کے تحت رضوان اللہ صاحب نے اپنے مضمون ''تعدد ازواج کی آیت کا مطالعہ'' کے دوسرے حصے میں تعدد ازواج اور اس کی تحدید کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ہے۔ اسی کے تحت ڈاکٹر خالد ظہیر صاحب نے اپنے مضمون مغربی ممالک کے دارالحرب ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔

''یسئلون'' میں مولانا اصلاحی صاحب سے شوریٰ سے متعلق پوچھے گئے دو اہم سوال نقل کیے گئے ہیں: ایک، کیا ارکان شوریٰ کی تعیین ثابت ہے۔ دوسرے، کیا امیر مجلس مشاورت کی اکثریت کے فیصلہ کا پابند ہوگا؟ اصلاحی صاحب نے قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کا جواب دیا ہے۔

''ادبیات'' میں جاوید احمد غامدی صاحب کی ایک غزل شائع کی گئی ہے۔

آخر میں قارئین کی مضامین تک آسان رسائی کے لیے راقم کا مرتب کردہ سالانہ اشاریہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الحجر

(۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نَبِّئۡ عِبَادِیۡۤ اَنِّیۡۤ اَنَا الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّ عَذَابِیۡ هُوَ الۡعَذَابُ الۡاَلِیۡمُ ﴿۵۰﴾
وَ نَبِّئۡهُمۡ عَنۡ ضَیۡفِ اِبۡرٰهِیۡمَ ﴿۵۱﴾ اِذۡ دَخَلُوۡا عَلَیۡهِ فَقَالُوۡا سَلٰمًا قَالَ اِنَّا مِنۡکُمۡ
وَجِلُوۡنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوۡا لَا تَوۡجَلۡ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمٍ عَلِیۡمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرۡتُمُوۡنِیۡ

(اے پیغمبر)، میرے بندوں کو بتاؤ کہ میں بڑا ہی بخشنے والا ہوں، میری شفقت ابدی ہے۔ اور (یہ بھی کہ) میرا عذاب بڑا ہی دردناک عذاب ہے۔ (یہ فرشتوں کو دکھانے کا مطالبہ کر رہے ہیں)، اِنھیں (یہ حقیقت[۱] سمجھانے کے لیے) ابراہیم کے مہمانوں کا قصہ سناؤ۔ جب وہ اُس کے پاس آئے تو اُنھوں نے کہا: تم پر سلام ہو۔ ابراہیم نے (اُن کے رویے میں کچھ اجنبیت دیکھی تو) کہا: ہمیں تم لوگوں سے اندیشہ محسوس ہو رہا ہے[۲]۔ وہ بولے: اندیشہ نہ کرو، ہم تمھیں ایک ذی علم[۳] لڑکے کی بشارت

---

[۱] یعنی یہ حقیقت کہ میں بڑا مہربان ہوں، لیکن اُس کے ساتھ بڑا ہی منتقم اور قہار بھی ہوں۔ اِس لیے یہ مطالبہ کر رہے ہو تو اِس بات پر بھی غور کر لو کہ اگر فرشتے آئے تو وہ تمھارے لیے کوئی بشارت لے کر آئیں گے یا صاعقۂ عذاب بن کر تمھاری بستیوں پر ٹوٹ پڑیں گے؟

عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ
الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾
قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾
اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾

دیتے ہیں۔ ابراہیم نے کہا: کیا تم مجھے بشارت دے رہے ہو، جبکہ مجھ پر بڑھاپا آ چکا ہے؟ سو اب کس چیز کی بشارت دیتے ہو؟[۴] اُنھوں نے جواب دیا: ہم نے تمھیں برحق بشارت دی ہے، اِس لیے مایوس نہ ہو۔ ابراہیم نے کہا: اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہوں کے سوا کون مایوس ہوسکتا ہے۔ ۴۹-۵۶

ابراہیم نے پوچھا: اے فرستادو، اب تمھاری مہم کیا ہے؟[۵] اُنھوں نے جواب دیا: ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ صرف لوط کے گھر والے مستثنیٰ ہیں۔ اُن سب کو ہم لازماً بچا لیں گے،[۶] اُس کی بیوی کے سوا۔ ہم نے ٹھیرا لیا ہے کہ وہ اُنھی میں ہوگی جو پیچھے رہ جائیں گے۔[۷] ۵۷-۶۰

۲ے ابراہیم علیہ السلام کے اِس ارشاد سے واضح ہے کہ وہ یہ بات سمجھ گئے تھے کہ فرشتوں کا اِس طرح علانیہ آنا خطرے سے خالی نہیں ہے، یہ لازماً کسی مہم کے لیے آئے ہیں۔ سورۂ ہود میں اِس واقعے کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے فرشتہ ہونے کا گمان اُنھیں اُس وقت ہوا، جب اُنھوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

۳ے یہ اِس بات کی طرف لطیف اشارہ تھا کہ وہ لڑکا علم نبوت سے بھی سرفراز ہوگا۔

۴ے ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہایت خوب صورت پیرائے میں اِس بات کی تصدیق چاہی ہے کہ تم جو بشارت مجھے دے رہے ہو، کیا یہ فی الواقع اُسی پروردگار کی طرف سے ہے جو بڑھاپے میں بھی اولاد دے سکتا ہے؟

۵ے یہ سوال بتا رہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دل کی کھٹک دور نہیں ہوئی اور اپنے لیے بشارت کے باوجود اُنھیں اندیشہ رہا کہ فرشتوں کی یہ پوری جماعت ضرور کسی دوسرے مقصد سے آئی ہے۔ وہ قوم لوط کے حالات سے واقف تھے، اِس لیے ممکن ہے کہ اُنھی کے بارے میں خیال کر رہے ہوں کہ یہ بجلی کہیں اِسی خرمن فساد پر تو گرنے والی نہیں ہے۔

۶ے یہ صراحت اِس لیے ضروری تھی کہ حضرت ابراہیم کم سے کم لوط اور اُن کے پیرووں کے بارے میں مطمئن ہو جائیں کہ وہ اِس عذاب کی زد میں نہیں آئیں گے۔ لوط علیہ السلام کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ حضرت ابراہیم

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ نِ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿٦٢﴾ قَالُوْا
بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿٦٣﴾ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٦٤﴾
فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا

پھر جب یہ فرستادے لوط کے لوگوں کے پاس پہنچے تو اُس نے کہا: تم لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ اُنھوں نے جواب دیا: (نہیں)، بلکہ ہم تمھارے پاس وہی چیز لے کر آ گئے ہیں جس میں یہ شک کر رہے تھے۔ ہم تمھارے پاس ایک قطعی حکم لے کر آئے ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں[۸]۔ لٰہذا اب تم کچھ رات رہے اپنے گھر والوں کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ اور تم اُن کے پیچھے پیچھے چلنا[۹] اور تم میں سے

کے بھتیجے تھے۔ اُن کی قوم اُس علاقے میں رہتی تھی جو شام کے جنوب میں عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے اور آج کل شرق اردن کہلاتا ہے۔ بائیبل میں اُن کے سب سے بڑے شہر کا نام سدوم بتایا گیا ہے۔ لوط علیہ السلام کا تعلق اُس قوم کے ساتھ وہی تھا جو حضرت موسیٰ کا قوم فرعون کے ساتھ تھا۔ اُن کی بیوی کا ذکر یہاں اور بعض دوسرے مقامات پر جس اسلوب میں ہوا ہے، اُس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اُن کی شادی اُسی قوم کے اندر ہوئی تھی اور اِس لحاظ سے وہ اُنھی کے ایک فرد بن چکے تھے۔

۷ یعنی اگرچہ پیغمبر کی بیوی ہے، لیکن خدا کا قانون بے لاگ ہے، وہ اُسے بھی نہیں چھوڑے گا۔ آیت میں اِس کے لیے لفظ 'قَدَّرْنَا' آیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...لفظ 'قَدَّرْنَا' کے صحیح مفہوم کو پیش نظر رکھیے تو اِس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ پیغمبروں اور نیکوں سے قرابت رکھنے کے باوجود اگر کوئی شخص، خواہ مرد ہو یا عورت، بدی کی راہ اختیار کرے تو وہ خدا کے غضب کا دوسروں کے مقابل میں زیادہ سزاوار ٹھیرتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۳۶۸)

۸ یہ تنبیہ اور توثیق کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں لڑکوں کی صورت میں دیکھ کر کسی غلط فہمی میں نہ پڑنا۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ شدنی ہے، اِس لیے اب بغیر کسی تردد کے اور بلا تاخیر ہماری ہدایات پر عمل کرو۔

۹ یہ اِس لیے فرمایا کہ اُن کے گھر والوں میں سے کوئی پیچھے نہ رہ جائے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، جس طرح راعی اپنے گلے کے پیچھے چلتا ہے کہ کوئی بھیڑ ریوڑ سے الگ رہ کر بھیڑیے کا شکار نہ ہو جائے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حَيۡثُ تُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيۡنَاۤ اِلَيۡهِ ذٰلِكَ الۡاَمۡرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَاۤءِ مَقۡطُوۡعٌ مُّصۡبِحِيۡنَ ﴿۶۶﴾

وَجَآءَ اَهۡلُ الۡمَدِيۡنَةِ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ﴿۶۷﴾ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَاۤءِ ضَيۡفِىۡ فَلَا تَفۡضَحُوۡنِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ ﴿۶۹﴾ قَالُوۡۤا اَوَلَمۡ نَنۡهَكَ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ هٰٓؤُلَاۤءِ

کوئی پلٹ کر نہ دیکھے[80] اور وہاں چلے جاؤ، جہاں تم کو جانے کی ہدایت کی جا رہی ہے۔ اور ہم نے اُس کو اپنا یہ فیصلہ پہنچا دیا[81] کہ صبح ہوتے ہی اِن لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔ ۶۱-۶۶

(اِس سے پہلے یہ[82] ہوا کہ لڑکوں کو لوط کے گھر آتے دیکھ کر) شہر کے لوگ خوشیاں مناتے ہوئے آ پہنچے[83]۔ لوط نے کہا: یہ میرے مہمان ہیں، اِس لیے میری فضیحت نہ کرو، اللہ سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو[84]۔

۸۰؎ یہ ہدایت کیوں ہوئی؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...کسی جگہ سے نکلتے ہوئے اُس کی طرف مڑ مڑ کے دیکھنا اِس بات کی علامت ہے کہ اُس کے ساتھ اُنس اور لگاؤ ہے۔ یہ اُنس اور لگاؤ عام حالات میں تو ایک فطری چیز ہے اور ایک فطری تقاضے کو روکا یا دبایا نہیں جا سکتا، لیکن جس بستی کے لیے اتمام حجت کے بعد عذاب الٰہی کا فیصلہ ہو چکا ہو، اُس سے نکلتے وقت اہل ایمان کو اِس طرح دامن جھاڑ کے اُٹھنا چاہیے کہ اُس کے ساتھ دل کے لگاؤ کا کوئی شائبہ بھی باقی نہ رہ جائے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۳۶۸)

۸۱؎ اصل میں لفظ 'قَضَيۡنَا' آیا ہے اور اُس کے ساتھ 'اِلٰی' کا صلہ ہے۔ یہ اِس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں 'أَبْلَغْنَا' یا اِس کے ہم معنی کسی لفظ کا مفہوم مقدر ہے۔

۸۲؎ سورۂ ہود میں یہ واقعہ جس ترتیب سے سنایا گیا ہے، اُس سے واضح ہے کہ بدمعاشوں کے حملے سے پہلے حضرت لوط اِس بات سے واقف نہ تھے کہ اُن کے مہمان درحقیقت فرشتے ہیں۔ یہی ترتیب واقعات کی فطری ترتیب ہے، اِس لیے کہ لوط علیہ السلام اگر اُن کی حقیقت سے واقف ہو چکے ہوتے تو اُس فریاد و فغاں کی ضرورت نہیں تھی جس کا ذکر آگے ہوا ہے۔ لیکن قرآن نے یہاں حملے کی روداد کو موخر کر دیا ہے، اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جس پہلو کو نمایاں کرنا مقصود ہے، وہ فرشتوں کا آنا ہے تاکہ مخاطبین یہ جان لیں کہ اُن کے مطالبے پر فرشتے آ گئے تو اُن کے لیے کیا لے کر آئیں گے۔ اِس طرح کی تقدیم و تاخیر کی مثالیں قرآن کے بعض دوسرے مقامات میں بھی ہیں۔

۸۳؎ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ بداخلاقی کی کس انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ لوط علیہ السلام جیسا مقدس

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بَنٰتِیۡۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ فٰعِلِیۡنَ ﴿۷۱﴾ لَعَمۡرُكَ اِنَّهُمۡ لَفِیۡ سَكۡرَتِهِمۡ یَعۡمَهُوۡنَ ﴿۷۲﴾ فَاَخَذَتۡهُمُ
الصَّیۡحَةُ مُشۡرِقِیۡنَ ﴿۷۳﴾ فَجَعَلۡنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡهِمۡ حِجَارَةً مِّنۡ

وہ بولے: کیا ہم نے تمھیں باہر کے سب لوگوں سے روک نہیں دیا تھا (کہ اُن کے اور ہمارے درمیان رکاوٹ نہ بنا کرو)[۸۵]۔ لوط نے (عاجز ہو کر) کہا: اگر تمھیں کچھ کرنا ہی ہے تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں[۸۶]۔ تیری جان کی قسم، (اے لوط، اِس وقت) یہ اپنی سرمستی میں اندھے ہو رہے ہیں۔ (ہم نے لوط کو تسلی دی)، پھر دن نکلتے ہی اُن کو ہماری ڈانٹ[۸۷] نے آپکڑا اور ہم نے وہ بستی اوپر تلے کر ڈالی اور اُن پر پکی

انسان اور معلم اخلاق ہے جس کے گھر پر یہ اِس لیے خوشیاں مناتے ہوئے پہنچ گئے ہیں کہ اِنھیں کچھ خوب رو لڑکے اُن کے گھر جاتے ہوئے نظر آ گئے ہیں جن سے یہ اپنی ہوس کی پیاس بجھا سکتے ہیں۔

۸۴؎ حضرت لوط نے یہ اِن لوگوں کو نہایت موثر انداز میں اپنی عزت و آبرو کا واسطہ اور خوف خدا کا حوالہ دے کر بدمعاشی سے روکنے کی کوشش کی ہے۔

۸۵؎ یعنی باہر سے آنے والوں کو ہم ماریں، لوٹیں یا اُن کی آبروریزی کریں، تم اِس میں رکاوٹ نہ بنا کرو۔ لوط علیہ السلام، ظاہر ہے کہ اِس سے پہلے بھی اُنھیں اِن سب باتوں سے روکتے رہے ہوں گے اور اُنھوں نے آپ کو اور آپ کے پیرووں کو دھمکیاں دی ہوں گی کہ ہماری بدمعاشیوں میں اِس طرح کی رکاوٹیں پیدا کر کے تم ہماری بستی میں نہیں رہ سکو گے۔ یہ اُن لوگوں نے اِسی کا حوالہ دیا ہے۔

۸۶؎ حضرت لوط کی طرف سے یہ اُن اوباشوں کے لیے کیا کوئی پیش کش تھی؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہ حضرت لوط کی طرف سے کوئی پیش کش نہیں تھی، بلکہ یہ اپنی قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے اُن کی آخری تدبیر تھی۔ اگر اُن لوگوں کے اندر اخلاقی حس کی کوئی رمق بھی ہوتی تو وہ سوچ سکتے تھے کہ ایک یہ شخص ہے جو اپنے مہمانوں کی عزت بچانے کے لیے اپنی عزت تک خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہے اور ایک ہم ہیں کہ اُس کی اور اُس کے مہمانوں کی عزت کے درپے ہیں۔ یہ بالکل اُسی طرح کی بات ہے، جس طرح ایک اعلیٰ کردار کا آدمی دوسرے کی جان یا آبرو بچانے کے لیے اپنی جان اور اپنے وقار کو خطرے میں ڈال دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۳۷۰)

۸۷؎ یہ اُس عذاب کی تعبیر ہے جو قوم لوط پر بھیجا گیا۔ بادتند کے ساتھ اُس میں رعد و برق کی کڑک اور چمک بھی

سِجِّیْلٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّھَا لَبِسَبِیْلٍ مُّقِیْمٍ ﴿۷۶﴾
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۷۷﴾

ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسا دی۔[۸۸] بے شک، اِس سرگذشت میں اُن لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو بصیرت حاصل کرنے والے ہوں۔ یہ بستی ایک عام گزر گاہ پر واقع ہے۔[۸۹] بے شک، اِس میں ایمان والوں کے لیے بھی بڑی نشانی ہے۔[۹۰] ۶۷-۷۷

تھی، اِس وجہ سے یہ لفظ اُس کے لیے نہایت موزوں استعمال ہوا ہے۔

۸۸؎ پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کی قومیں بالعموم پتھر برسانے والی آندھی سے تباہ کی گئی ہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ اِسے 'حَاصِب' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اُسی کا بیان ہے۔

۸۹؎ سدوم اور عمورہ کی بستیاں حجاز اور شام کے تجارتی راستے پر واقع تھیں۔ دونوں ملکوں کے تجارتی قافلوں کے لیے یہ راستہ عام گزر گاہ تھا۔ اِس سے قافلے گزرتے تو لوگ تباہی کے اُن آثار کو دیکھتے تھے جو اِس علاقے میں آج بھی نمایاں ہیں۔

۹۰؎ قریش مکہ کے بعد اب یہ اہل ایمان کو بھی متوجہ کیا ہے کہ وہ بھی اگر چاہیں تو اِن آثار میں اپنے دشمنوں کا مستقبل دیکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا مطمئن رہیں، بالآخر وہی کامیاب ہوں گے اور اُن کے دشمن اِسی طرح پامال ہو جائیں گے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معز امجد
ترجمہ وتدوین: شاہد رضا

اچھائی کی دعوت کا اجر

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

رُوِیَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ دَعَا إِلٰی هُدًی كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلُ أُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهُ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئًا وَمَنْ دَعَا إِلٰی ضَلَالَةٍ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ تَبِعَهُ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئًا.

وَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ دَلَّ عَلٰی خَيْرٍ فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ.

روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے ہدایت کی طرف دعوت دی، اس کے لیے ان لوگوں کے اجر کے برابر اجر ہوگا جو اس کی اس دعوت[1] پر عمل پیرا ہوں گے۔ اس سے ان کے اجروں میں کچھ کمی نہیں ہوگی[2]۔ (اس کے برخلاف)، جس شخص نے کسی گمراہی کی طرف دعوت دی، اس پر ان لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ (کا بوجھ) ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے۔ اس سے ان کے گناہوں (کے بوجھوں) میں کچھ کمی نہیں ہوگی۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے کسی اچھائی کی طرف رہنمائی کی، اسے اسی طرح کا اجر ملے گا، جس طرح کا اجر اس اچھائی کے کرنے والے کو ملے گا[۳]۔

حواشی کی توضیح

۱۔ یہ ایک امر واقعی ہے کہ اچھائی اور ہدایت کی طرف دعوت دینا فی ذاتہٖ ایک اچھا عمل اور ایک عظیم اجر اور صلے کا باعث ہے۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ کسی شخص کی دعوت سنی جائے اور اس کی پیروی کی جائے تو داعی کو نہ صرف اس کے اس دعوتی اقدام کا اجر عطا فرماتا ہے، بلکہ اس کی دعوت کے نتیجے میں صادر ہونے والے اعمال کا بھی اجر مرحمت فرماتا ہے۔

۲۔ یہ اجر کسی ایک شخص کے اعمال نامے سے دوسرے شخص کے اعمال نامے میں منتقل نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ ایک داعی کسی دوسرے شخص کے اعمال کا اجر نہیں پائے گا۔ اس کے برعکس، داعی کی دعوت پر جہاں بھی عمل ہوگا، یہ اس کی ہدایت کی طرف محض دعوت ہی ہے جو اس کے لیے ہر قدم پر ثواب کی حامل ہوگی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۳۔ جب کوئی شخص کسی عمل خیر کی نیت کر لیتا اور اس پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیتا ہے، پھر اپنے بعض حالات کے باعث اس پر عمل کرنے سے قاصر رہتا ہے یا کوئی شخص بذات خود کسی حالت میں عمل خیر کی استطاعت نہیں رکھتا، تو وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ اس عمل خیر میں معاونت کے سبب سے نہ صرف اچھے عمل کے ارادے اور نیت کے اجر کا مستحق ٹھہرے گا، بلکہ اس عمل صالح کے حامل لوگوں کی رہنمائی اور معاونت کا بھی اجر پائے گا۔

متون

پہلی روایت بعض اختلافات کے ساتھ مسلم، رقم ۲۶۷۴؛ ابوداؤد، رقم ۴۶۰۹؛ ترمذی، رقم ۲۶۷۴؛ ابن ماجہ، رقم ۲۰۵–۲۰۷، ۲۰۹–۲۱۰؛ احمد، رقم ۹۱۴۹؛ ابن حبان، رقم ۱۱۲؛ دارمی، رقم ۵۱۳؛ موطا امام مالک، رقم ۵۰۹؛ مسند ابویعلیٰ، رقم ۶۴۸۹ اور ابن خزیمہ، رقم ۲۴۷۷ میں روایت کی گئی ہے۔

دوسری روایت بعض اختلافات کے ساتھ مسلم، رقم ۱۸۹۳الف، ۱۸۹۳ب؛ ترمذی، رقم ۲۶۷۱؛ ابوداؤد، رقم ۵۱۲۹؛ احمد، رقم ۱۷۱۲۵، ۱۷۱۲۷، ۲۲۳۹۳، ۲۲۴۰۵؛ ابن حبان، رقم ۲۸۹، ۱۶۶۸؛ بیہقی، رقم ۱۷۶۲۱–۱۷۶۲۲ اور عبدالرزاق، رقم ۲۰۰۵۴ میں روایت کی گئی ہے۔

پہلی روایت

بعض روایات، مثلاً ابن ماجہ، رقم ۲۰۵ میں 'من دعا إلی هدی' (جس شخص نے ہدایت کی طرف دعوت دی) کے الفاظ کے بجائے 'أیما داع دعا إلی هدی فأتبع' (ہر وہ داعی جس نے ہدایت کی طرف دعوت دی، پھر اس کی پیروی کی گئی) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں؛ جبکہ موطا امام مالک، رقم ۵۰۹ میں یہ الفاظ 'ما من داع یدعو إلی هدی' (ہر وہ داعی جو ہدایت کی طرف دعوت دے) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ابن ماجہ، رقم ۲۰۵ میں 'کان له من الأجر مثل أجور من تبعه' (اس کے لیے ان لوگوں کے اجر کے برابر اجر ہوگا جو اس کی اس دعوت پر عمل پیرا ہوں گے) کے الفاظ کے بجائے 'فإن له مثل أجور من اتبعه' (بے شک، اس کے لیے ان لوگوں کے اجر کے برابر اجر ہوگا جو اس کی اس دعوت پر عمل پیرا ہوں گے) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں؛ ابن ماجہ، رقم ۲۰۶ میں یہ الفاظ 'کان له من الأجر مثل أجور من اتبعه' (اس کے لیے ان لوگوں کے اجر کے برابر اجر ہوگا جو اس کی اس دعوت پر عمل پیرا ہوں گے) روایت کیے گئے ہیں؛ موطا امام مالک، رقم ۲۰۹ میں یہ الفاظ 'إلا کان له مثل أجر من أتبعه' (مگر اس کے لیے اس شخص کے اجر کے برابر اجر ہوگا جو اس کی اس دعوت پر عمل پیرا ہوگا) روایت کیے گئے ہیں؛ ترمذی، رقم ۲۶۷۴ میں ان الفاظ کے مترادف الفاظ 'کان له من الأجر مثل أجور من یتبعه' (اس کے لیے ان لوگوں کے اجر کے برابر اجر ہوگا جو اس کی اس دعوت پر عمل پیرا ہوں گے) روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ابن ماجہ، رقم ۲۰۵ میں 'لا ینقص ذلك من أجورهم شیئًا' (اس سے ان کے اجروں میں کچھ کمی نہیں ہوگی) کے الفاظ کے بجائے 'و لا ینقص من أجورهم شیئًا' (اور ان کے اجروں میں کچھ کمی نہیں ہوگی) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں؛ ابن حبان، رقم ۱۱۲ میں یہ الفاظ 'لا ینقص من أجورهم شیء' (ان کے اجروں میں کچھ کمی نہیں ہوگی) روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ابن ماجہ، رقم ۲۰۵ میں 'من دعا إلی ضلالة' (جس شخص نے کسی گمراہی کی طرف دعوت دی) کے الفاظ کے بجائے 'أیما داع دعا إلی ضلالة فاتبع' (ہر وہ داعی جس نے گمراہی کی طرف دعوت دی، پھر اس کی پیروی کی گئی) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں؛ موطا امام مالک، رقم ۵۰۹ میں یہ الفاظ 'ما من داع یدعو إلی ضلالة' (ہر وہ داعی جو گمراہی کی طرف دعوت دیتا ہے) روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً دارمی، رقم ۵۱۳ میں 'کان علیه من الإثم مثل آثام من تبعه' (اس پر ان لوگوں کے

گناہوں کے برابر گناہ کا بوجھ ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے) کے الفاظ کے بجاے ان کے مترادف الفاظ 'كان عليه من الإثم مثل آثام من اتبعه' (اس پر ان لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ کا بوجھ ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے) روایت کیے گئے ہیں؛ ابن ماجہ، رقم ۲۰۵ میں یہ الفاظ 'فإن له مثل أوزار من اتبعه' (اس پر ان لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ کا بوجھ ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے) روایت کیے گئے ہیں؛ ابن ماجہ، رقم ۲۰۶ میں یہ الفاظ 'فعليه من الإثم مثل آثام من اتبعه' (اس پر ان لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ کا بوجھ ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے) روایت کیے گئے ہیں؛ موطا امام مالک، رقم ۵۰۹ میں یہ الفاظ 'كان عليه مثل أوزارهم' (اس پر ان لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ کا بوجھ ہوگا) روایت کیے گئے ہیں؛ ترمذی، رقم ۲۶۷۴ میں ان الفاظ کے بجاے ان کے مترادف الفاظ 'كان عليه من الإثم مثل آثام من يتبعه' (اس پر ان لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ کا بوجھ ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے) روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ابن ماجہ، رقم ۲۰۵ میں 'لا ينقص ذلك من آثامهم شيئًا' (اس سے ان کے گناہوں (کے بوجھوں) میں کچھ کمی نہیں ہوگی) کے الفاظ کے بجاے 'لا ينقص من أوزارهم شيئًا' (ان کے بوجھوں میں کچھ کمی نہیں ہوگی) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں؛ موطا امام مالک، رقم ۵۰۹ میں ان الفاظ کے بجاے ان کے مترادف الفاظ 'لا ينقص ذلك من أوزارهم شيئًا' (اس سے ان کے بوجھوں میں کچھ کمی نہیں ہوگی) روایت کیے گئے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دوسری روایت

بعض روایات، مثلاً احمد، رقم ۲۲۴۰۵ میں 'مثل أجر فاعله' (اس کے کرنے والے کے اجر کی طرح) کے الفاظ کے بجاے ان کے مترادف الفاظ 'مثل أجر عامله' (اس کے کرنے والے کے اجر کی طرح) روایت کیے گئے ہیں۔

بیہقی، رقم ۱۷۶۲۱ میں یہ روایت 'من دل على خير فله أجر مثل فاعله' (جس شخص نے کسی اچھائی کی طرف رہنمائی کی، اسے اسی طرح کا اجر ملے گا، جس طرح کا اجر اس اچھائی کے کرنے والے کو ملے گا) کے الفاظ میں روایت کی گئی ہے۔

بیش تر روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درج بالا ارشاد ایک واقعے کے ایک حصے کے طور پر روایات کیا

گیا ہے۔جیسا کہ ابوداؤد میں روایت کیا گیا ہے، اس روایت کا پس منظر درج ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

جاء رجل إلى النبی صلى الله عليه وسلم فقال: يا رسول الله، إنی أبدع بی فاحملنی، قال: لا أجد ما أحملك عليه ولكن ائت فلانًا فلعله أن يحملك فأتاه فحمله، فأتى رسول الله صلى الله عليه وسلم فأخبره، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من دل على خير فله مثل أجر فاعله. (رقم ۵۱۲۹)

''ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ، میں سنگین حالت میں ہوں (اور مہم میں نہیں جا سکتا ہوں)، اس لیے مجھے کوئی سواری دے دیجیے (تاکہ میں آپ کے ساتھ جا سکوں)، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: میرے پاس ایسی کوئی شے نہیں جس پر میں تجھے سوار کرا سکوں، مگر تم فلاں شخص کے پاس جاؤ، شاید وہ تمھیں کوئی سواری دے دے۔ چنانچہ وہ اس فلاں شخص کے پاس گیا تو اس نے اسے سواری دے دی۔ پھر وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ کو اس بارے میں آگاہ کیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے کسی اچھائی کی طرف رہنمائی کی، اسے اسی طرح کا اجر ملے گا، جس طرح کا اجر اس اچھائی کے کرنے والے کو ملے گا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عرب عدنان، قحطان اور قضاعہ کی ذریت ہیں۔ ان میں سے عدنان بن ادد (یا اد) ہی واحد شخص ہیں جن کے اولاد اسمٰعیل علیہ السلام ہونے میں کسی نے شک نہیں کیا۔ مضر عدنان کے پڑپوتے تھے، سُلیم بن منصور قیس عیلان بن مضر کے سکڑپوتے تھے جن سے بنوسُلیم کا قبیلہ منسوب ہوا۔ یہ قبیلہ بالائی نجد میں خیبر کے قرب و جوار میں بودوباش رکھتا تھا، حضرت عمرو بن عبسہ اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت عمرو کے دادا کا نام خالد بن عامر (ابن حجر) یا عامر بن خالد (ابن عبدالبر، ابن اثیر) تھا۔ تیسری روایت (ابن سعد) کے مطابق خالد بن حذیفہ ان کے دادا تھے۔ چوتھی روایت ابن حزم نے ''جمہرۃ انساب العرب'' میں بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ منقذ بن خالد حضرت عمرو بن عبسہ کے دادا اور حذیفہ سکڑدادا تھے۔ سُلیم ان کے آٹھویں (ابن عبدالبر، ابن حجر) یا دسویں (ابن سعد) جد تھے، اس نسبت سے وہ سلمی اور اپنے ساتویں جد مالک بن ثعلبہ کی زوجہ بجلہ بنت ہناۃ کی نسبت سے بجلی کہلاتے ہیں۔ ابونجیح یا ابوشعیب ان کی کنیت تھی۔ حضرت عمرو بن عبسہ حضرت ابوذر غفاری کے ماں جائے بھائی تھے۔ رملہ بنت وقیعہ غفاریہ دونوں اصحاب کی والدہ تھیں۔ ابن جوزی نے حضرت عمرو کے والد کا نام عنبسہ تحریر کیا ہے۔

حضرت عمرو بن عبسہ سلیم الطبع تھے اور زمانۂ جاہلیت ہی میں بت پرستی سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ اپنی نیک فطرت کی وجہ سے انھوں نے اسلام کی طرف لپکنے میں بھی پہل کی۔ خود فرماتے ہیں: میں ایمان لانے والا چوتھا شخص تھا۔ ابوامامہ باہلی نے حضرت عمرو سے پوچھا: آپ بنوسلیم کے ایک فرد اور صاحب حیثیت بزرگ ہیں۔ اپنے آپ کو اسلام میں داخل ہونے والا چوتھا فرد کس طرح قرار دیتے ہیں؟ انھوں نے بتایا: زمانۂ جاہلیت ہی میں میرا خیال تھا

کہ ہماری قوم گمراہ ہو چکی ہے۔ یہ بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور ان کا کوئی دین نہیں۔ ایک بار میں ایسی ہی گفتگو کر رہا تھا کہ کسی آدمی نے سن کر کہا: مکہ میں ایک شخص ہے جو یہی بات کرتا ہے، میں نے سواری پکڑی اور مکہ پہنچ گیا۔ آپ کا کھوج لگاتا رہا، پھر پتا چلا کہ آپ مخفی رہتے ہیں۔ رات کے وقت خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں، اس وقت آپ سے ملا جا سکتا ہے۔ میں کعبہ کے پردوں میں چھپ کر سو گیا اور آپ کی آواز سن کر بیدار ہوا۔ آپ لا الٰہ الا اللہ کا ورد کر رہے تھے۔ میں باہر نکلا اور پوچھا: آپ کون ہیں؟ فرمایا: میں اللہ کا نبی ہوں۔ پوچھا: نبی کیا ہوتا ہے؟ فرمایا: اللہ کا رسول (پیغمبر)۔ میں نے پھر پوچھا: کیا اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ فرمایا: ہاں۔ میں نے سوال کیا: کیا پیغام دے کر آپ کو مبعوث کیا ہے؟ فرمایا: یہ کہ اللہ اکیلے کو معبود مانا جائے اور کسی کو بھی اس کا شریک نہ بنایا جائے، بتوں کو توڑ دیا جائے، رحم کے رشتوں کو جوڑا جائے، خون ریزی بند کی جائے اور راستوں کو محفوظ بنایا جائے۔ میں نے پوچھا: اس دین میں آپ کا ساتھ کون دے رہا ہے؟ جواب فرمایا: ایک آزاد اور ایک غلام۔ تب سیدنا ابوبکر اور سیدنا بلال آپ کے ساتھ تھے۔ میں نے کہا: ہاتھ بڑھائیے، میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔ تب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اسلام کی بیعت کی۔ پھر کہا: میں آپ کے ساتھ ساتھ رہوں گا۔ آپ نے فرمایا: تم دیکھ نہیں رہے کہ لوگ میرے لائے ہوئے نور ہدایت کو ناپسند کر رہے ہیں، اس لیے آج تم یہاں رہ نہیں سکو گے، اپنے اہل خانہ کے پاس واپس چلے جاؤ اور جب یہ سنو کہ میں مکہ سے نکل آیا ہوں (یا مجھے غلبہ حاصل ہو گیا ہے) تو میرے پاس چلے آنا (مسلم، رقم ۱۸۸۲۔ احمد، رقم ۱۶۹۵۳)۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ آپ کے ارشاد 'غلام' اور 'آزاد' کا اطلاق محض سیدنا ابوبکر و سیدنا بلال پر کرنا درست نہیں۔ ان الفاظ کو اسماے جنس سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ صحابہ کی ایک جماعت حضرت عمرو بن عبسہ سے پہلے اسلام قبول کر چکی تھی۔ مثلاً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت زید بن حارثہ، سیدنا بلال سے بھی پہلے ایمان لا چکے تھے۔ حضرت عمرو بن عبسہ اپنے آپ کو چوتھا مسلمان اپنی معلومات کے مطابق قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس وقت مسلمان اپنا اسلام چھپاتے تھے۔ ان کے ایمان کا علم ان کے رشتہ داروں کی اکثریت کو نہ ہوتا تھا کجا اجنبیوں اور اہل بادیہ کو یہ خبر مل پاتی۔

اسلام لانے کے بعد حضرت عمرو بن عبسہ بنوسُلیم کے علاقوں صُفینہ اور حاذہ (جادہ) میں مقیم رہے۔ خود بیان کرتے ہیں کہ میں مسلمان ہونے کے بعد اپنے گھر والوں کے پاس چلا آیا اور ایک لمبا عرصہ آپ کی اطلاع آنے کا انتظار کرتا رہا۔ ہمارا گھر قافلوں کی گزرگاہ سے زیادہ دور نہ تھا۔ میں مکہ سے آنے والے قافلوں سے پوچھتا رہتا، کیا وہاں کوئی واقعہ رونما ہوا ہے؟ اس طرح مجھے پتا چل گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے یثرب تشریف لے

آئے ہیں۔ پھر یثرب سے ایک قافلہ آیا تو میں نے استفسار کیا، مکہ کے اس شخص کے کیا احوال ہیں جو آپ کے شہر میں ہجرت کر آیا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ آپ کی قوم نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا، لیکن مشیت ایزدی حائل ہوئی اور دشمن کامیاب نہ ہو سکے۔ میں لوگوں کو چھوڑ کر بھاگا، اپنی سواری پکڑی اور مدینہ چلا آیا۔ آپ کے پاس پہنچا اور پوچھا: کیا آپ نے مجھے پہچان لیا ہے؟ فرمایا: ہاں تو وہی ہے جو مکہ میں میرے پاس آیا تھا۔ میں نے گزارش کی کہ اللہ نے آپ کو جو سکھایا ہے، مجھے بھی اس میں سے تلقین کیجیے۔ آپ نے فرمایا: جب تو فجر کی نماز ادا کر لے تو سورج طلوع ہونے تک کوئی نفلی نماز نہ پڑھنا۔ طلوع ہونے کے بعد بھی جب سورج چمڑے کی ڈھال کی طرح سرخ ہو، نماز میں مشغول نہ ہونا، کیونکہ یہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان سے نکلتا ہے اور اس وقت کفار اسے سجدہ کرتے ہیں۔ سورج جب ایک نیزہ یا دو نیزوں کی مقدار کے برابر بلند ہو جائے تو نوافل پڑھنا، اس لیے کہ اس وقت نماز حضوری کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اور مقبول ہوتی ہے۔ سورج بلند ہونے میں ایک نیزہ کے برابر کسر رہ جائے (یا آدمی کا سایہ ہم مثل ہو جائے) تو بھی نماز ادا کرنے سے رک جانا، کیونکہ یہ وہ وقت ہے جب جہنم دہکائی جاتی ہے۔ جب سایہ مشرق کی جانب ڈھل جائے تو نماز میں مصروف ہو جانا، اس وقت نماز مقبول و مشہود ہوتی ہے۔ یہ وقت تب تک رہتا ہے جب تم عصر کی نماز پڑھ لو۔ عصر کے بعد سورج ڈوبنے تک نماز نہ پڑھنا، اس لیے کہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے مابین غروب ہوتا ہے۔ تب کفار اس کے آگے ماتھا ٹیکتے ہیں۔ حضرت عمرو بن عبسہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا، یارسول اللہ! مجھے وضو کے بارے میں بتائیے۔ آپ نے فرمایا: تم میں سے جو کوئی بھی وضو کر کے قربت الٰہی حاصل کرنا چاہتا ہے، کلی کرتا ہے اور پانی پھینکتا ہے، پھر ناک میں پانی ڈالتا ہے اور نکالتا ہے تو اس کے منہ اور ناک کے دونوں اطراف کے گناہ پانی میں بہ جاتے ہیں۔ وہ جب منہ اس طرح دھوتا ہے، جس طرح اللہ کا حکم ہے تو اس کے چہرے کے گناہ ڈھل کر ڈاڑھی کے کناروں سے گر جاتے ہیں۔ جب وہ ہاتھوں کو کلائیوں سمیت دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں کے گناہ انگلیوں کے پوروں کے کناروں سے پانی کے ساتھ بہ جاتے ہیں۔ وضو کرنے والا جب اللہ کے ارشاد پر عمل کرتے ہوئے سر پر مسح کرتا ہے تو اس کے سر کے گناہ بالوں کے سروں سے پانی کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ آخر میں وہ پاؤں ٹخنوں سمیت دھوتا ہے، جیسے اس کو اللہ کا حکم ہے، اس کے قدموں کے گناہ انگلیوں کی پوروں کے کناروں سے پانی میں بہ جاتے ہیں۔ وضو کرنے والا پھر کھڑا ہوتا ہے اور ان الفاظ میں اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہے جس کا وہ حق دار ہے اور دوگانہ ادا کرتا ہے تو اس کے تمام گناہ جھڑ جاتے ہیں، اس دن کی طرح جب اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔ راوی ابوامامہ نے کہا: جناب عمرو بن عبسہ، دیکھیے تو سہی، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ نے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سے سن رکھا ہے؟ کیا وضو کرنے اور نماز پڑھنے والے کو یہ سب کچھ اسی وقت مل جائے گا؟ حضرت عمرو نے جواب دیا: اے ابوامامہ، میں بوڑھا ہو گیا ہوں، ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اور موت قریب آ گئی ہے، مجھے کیا ضرورت کہ اللہ اور اس کے رسول پر جھوٹ باندھوں؟ میں نے یہ ارشاد آپ سے ایک دو بار نہیں، بلکہ سات دفعہ سنا ہے (مسلم، رقم ۱۸۸۲۔ نسائی، رقم ۱۴۷۔ احمد، رقم ۱۶۹۵۶)۔ اس سے ملتی جلتی دوسری روایت میں اضافہ ہے کہ یا نبی اللہ، کون سی گھڑی ہے جس میں دعا اور نماز سب سے زیادہ مقبول ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا: رات کا آخری پہر، رب اس وقت اپنے بندے کے قریب ترین ہوتا ہے۔ اگر تو اس گھڑی اللہ کا ذکر کر سکتا ہے تو ضرور کر (ابوداؤد، رقم ۱۲۷۷۔ نسائی، رقم ۵۷۳)۔

ابوامامہ ہی کی دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرو بن عبسہ نے بتایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت ملا جب آپ بازار عکاظ میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ ایمان لانے کے بعد میں نے پوچھا: یا رسول اللہ، میں آپ کے ساتھ رہوں یا اپنی قوم میں واپس چلا جاؤں؟ فرمایا: اپنی قوم کے ساتھ رہو، حتیٰ کہ اللہ تمھارے رسول کو طاقت دے دے۔ چنانچہ میں فتح مکہ سے کچھ دیر پہلے مدینہ آیا اور سلام کے بعد عرض کیا: یا رسول اللہ، میں عمرو بن عبسہ سلمی ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سے وہ پوچھوں جو آپ جانتے ہیں اور میں نہیں جانتا، جو میرے لیے نفع بخش ہو اور آپ کے لیے باعث ضرر نہ ہو۔ کون سی گھڑی بہترین ہے؟ کون سا وقت ہے جس میں تقویٰ حاصل کیا جا سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: تو نے وہ بات پوچھی ہے جو تم سے پہلے کسی نے نہیں پوچھی۔ اللہ رات کے درمیانی حصے میں خوب توجہ فرماتا ہے اور شرک و بغاوت کے علاوہ تمام گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ اس وقت نماز بڑی حضوری سے ادا ہوتی ہے اور خوب مقبول ہوتی ہے۔ تو سورج طلوع ہونے تک نماز پڑھ سکتا ہے (احمد، رقم ۱۹۳۲۶۔ مستدرک حاکم، رقم ۴۴۱۹)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ابوامامہ سے مروی تیسری روایت اس طرح ہے کہ حضرت عمرو بن عبسہ نے بتایا: جاہلیت میں، میں اپنی قوم کے خداؤں سے متنفر تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ میں اہل کتاب میں سے ایک شخص سے ملا جو وادی القریٰ کے پاس واقع یہودیوں کے مسکن تیما کا رہنے والا تھا اور اسے بتایا: میں بتوں کی پوجا کرنے والی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک بار ہمارا قبیلہ ایسی جگہ قیام پذیر ہوا جہاں کوئی صنم نہ تھا۔ ایک شخص نکلا اور چار پتھر اٹھا لایا، تین پتھروں کا چولہا بنا کر اس پر ہنڈیا چڑھا دی اور سب سے عمدہ اور خوب صورت نظر آنے والے چوتھے پتھر کو معبود بنا کر پوجنے لگا۔ ممکن تھا کہ کوچ کرنے سے پہلے اسے اس سے اچھا پتھر ملتا تو پہلے صنم کو پھینک کر اس کی بندگی کرنے لگتا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ یہ معبودان باطلہ ہیں، نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر۔ آپ مجھے اس دین سے بہتر دین کی راہ سجھائیے۔ اس نے بتایا کہ مکہ سے ایک شخص ظاہر ہوگا، اپنی قوم کے معبودوں سے بے زاری کا اظہار کرے گا اور انھیں چھوڑ کر معبود واحد کی

طرف بلائے گا۔ وہی بہترین دین پیش کرے گا۔ جب تو اس کا کلام سن لے تو اس کی پیروی کرنا۔ اب مکہ جانا ہی میرا مقصد بن گیا۔ میں پوچھتا رہتا: کیا وہاں کوئی واقعہ رونما ہوا ہے؟ پھر وہ وقت آیا کہ ایک سوار مکہ سے آیا اور اس نے وہی واقعات سنائے جو میں مذکورہ اہل کتاب سے سن چکا تھا۔ میں نے رخت سفر باندھا اور مکہ پہنچ گیا۔

حضرت جُبیر بن نفیر کہتے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاری اور حضرت عمرو بن عبسہ دونوں کہا کرتے تھے: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے آپ کو چوتھا مسلمان پایا ہے۔ مجھ سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر اور بلال کے علاوہ کوئی اسلام نہ لایا تھا۔'' دونوں حضرات یہی کہا کرتے، ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان میں سے دوسرا کب ایمان لایا۔ اہل صفہ میں شامل مشہور صحابی حضرت عرباض بن ساریہ بھی بنوسُلیم سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بھی حضرت عمرو بن عبسہ کی طرح اسلام کے ابتدائی زمانے میں ایمان لائے۔

بدر، احد اور خندق کی جنگیں ہو چکیں تو حضرت عمرو بن عبسہ مدینہ پہنچے اور یہاں سکونت اختیار کر لی۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ فتح خیبر کے بعد مدینہ آئے (مسلم، رقم ۸۳۲)۔

حضرت عمرو بن عبسہ غزوۂ طائف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک تھے۔ خود روایت کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طائف کے قلعے کا محاصرہ کیا۔ میں نے آپ کو یہ ارشاد فرماتے سنا: جس نے ایک تیر پھینکا، اسے جنت میں ایک درجہ حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ اس روز میں نے سترہ تیر برسائے۔ حضرت عمرو مزید بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے بھی سنا: جس نے اللہ کی راہ میں ایک تیر چلایا، دشمن کو لگا یا نہ لگ سکا، ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب پائے گا۔ جس نے اللہ کی راہ میں اپنا بڑھاپا گزارا، روز قیامت اس کے لیے نور کا کام دے گا۔ جس نے ایک مسلمان غلام آزاد کیا، اللہ تعالیٰ غلام کی ہر ہڈی کے بدلے میں اس کی ہر ہڈی بچائے گا۔ اور جس کسی نے مومنہ عورت آزاد کی، اللہ تعالیٰ عورت کی ایک ایک ہڈی کے بدلے میں آزاد کرنے والے کی ایک ایک ہڈی کو دوزخ سے بچا لے گا (ابوداؤد، رقم ۳۹۶۵۔ ترمذی، رقم ۱۶۳۵۔ نسائی، رقم ۳۱۴۴)۔

حضرت عمرو بن عبسہ نے غزوۂ فتح مکہ میں شرکت کی۔

حضرت کعب کے غلام نے بیان کیا: ہم حضرت عمرو بن عبسہ، حضرت مقداد بن عمرو اور حضرت مسافع بن حبیب کے ساتھ سفر پر نکلے۔ سب کے ساتھ مویشی بھی تھے۔ ایک دن کڑی دوپہر کے وقت میں نے دیکھا کہ حضرت عمرو بن عبسہ سوئے پڑے ہیں اور ان پر ایک بادل سایہ فگن ہے۔ ایسے لگتا تھا کہ خاص انھی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ وہ بیدار ہوئے اور بتایا: یہ ابر آتا رہتا ہے، پھر مجھے متنبہ کیا کہ یہ بات کسی کو ہرگز نہ بتانا۔ مجھے پتا چلا کہ تو نے ایسا کیا ہے تو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تمھاری خیر نہ ہو گی۔ واللہ، ان کی وفات تک میں نے یہ بات کسی کو نہ بتائی (حلیۃ الاولیاء: ۱۳۷۹)۔

جمادی الثانی ۱۳ھ: عہد صدیقی کے آخر میں جنگ یرموک ہوئی۔ یرموک (Hieromyax) گولان کی پہاڑیوں کے جنوب مشرق میں چالیس میل کے فاصلے پر ایک سطح مرتفع ہے جو موجودہ اسرائیل، اردن اور شام کی درمیانی سرحد پر واقع ہے۔ رومی فوج کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار، جبکہ اہل ایمان کی نفری چالیس ہزار سے کچھ کم یا زیادہ تھی۔ طبری کے بیان کے مطابق حضرت خالد بن ولید اس وقت سپہ سالار نہیں، بلکہ ایک کمانڈر تھے۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ باری باری ہر جرنیل کو سالاری کا موقع دیا جائے۔ اس طرح پہلے دن کی کمان ان کے حصے میں آئی۔ اپنی فوج کو بے ترتیب پا کر انھوں نے ایک خطبہ دیا جس میں فوج کی صف بندی اور تنظیم کی اہمیت واضح کی۔ ادھر عیسائی راہبوں نے اپنے پیروؤں کو جنگ پر انگیخت کیا۔ حضرت خالد نے فوج کو چالیس کے قریب چھوٹے چھوٹے دستوں میں بانٹ دیا، ہر دستہ کم و بیش ایک ہزار فوجیوں پر مشتمل تھا۔ قلب میں حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کی قیادت میں اٹھارہ دستے، میمنہ پر حضرت عمرو بن عاص کی کمان میں دس دستے اور میسرہ پر حضرت یزید بن ابوسفیان کی سربراہی میں دس دستے تھے۔ ہراول دستے پر حضرت قباب بن اشیم مقرر تھے۔ ایک دستے کی سربراہی حضرت عمرو بن عبسہ کے پاس تھی۔ دوسرے کمانڈروں میں حضرت قعقاع بن عمرو، حضرت عیاض بن غنم، حضرت ہاشم بن عتبہ، حضرت خالد بن سعید شامل تھے۔ حضرت ابوالدرداء کو قاضئ لشکر، حضرت عبداللہ بن مسعود کو امیر بند و بست اور حضرت ابوسفیان کو واعظ بنایا گیا۔ تاریخ اسلام کے اس اہم معرکے میں مسلمانوں کو زبردست فتح حاصل ہوئی۔ تین ہزار اہل ایمان نے جام شہادت نوش کیا، جبکہ ایک لاکھ بیس ہزار رومی جہنم واصل ہوئے۔ رومی کمانڈر ان چیف، شاہ ہرقل کا بھائی تذراق (Theodore) اپنے انجام کو پہنچا اور شام میں رومی سلطنت (Byzantine or Eastern Roman Empire) کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جنگ یرموک میں حصہ لینے کے بعد حضرت عمرو بن عبسہ شام کے شہر حمص میں مقیم ہو گئے۔ رکوی ندی کے پاس ابن ابوسحنہ کی گلی میں ان کا گھر تھا۔ حمص میں بنوسلیم کے چار سو مزید اہل ایمان سکونت رکھتے تھے۔

۱۷ھ میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ زندگی میں آخری بار شام گئے، مہاجرین وانصار کی ایک جماعت ان کے ساتھ تھی۔ سیدنا علی کو مدینہ کا قائم مقام امیر مقرر کر کے وہ حجاز اور شام کی سرحد پر واقع شہر ایلہ پہنچے۔ ہر ضلع میں گھوم کر انھوں نے شام کی چوکیوں کو محفوظ بنایا، گرما و سرما کی الگ الگ فوجیں مقرر کر کے ان میں وظائف تقسیم کیے۔ سیدنا عمر نے حضرت عبداللہ بن قیس کو ساحلی علاقوں کا حاکم بنانے اور اردن کے گورنر حضرت شرحبیل بن حسنہ

کو معزول کر کے گورنر دمشق حضرت معاویہ کو شام کے پورے صوبے کا حاکم مقرر کرنے کے احکامات جاری کیے۔ حضرت عمرو بن عبسہ کو اہرا کا امیر نامزد کر کے وہ شام سے رخصت ہوئے اور ذوالحجہ کے مہینے میں مدینہ پہنچ گئے۔

حضرت معاویہ نے رومیوں سے جنگ بندی کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ مدت معاہدہ ختم ہونے سے پہلے ہی وہ لشکر لے کر چل پڑتے اور جونہی مدت پوری ہوتی، ان پر حملہ کر دیتے۔ اسی طرح کے ایک واقعہ میں لوگوں نے دیکھا کہ ایک شخص عربی یا تر کی گھوڑے پر سوار پکارتے ہوئے چلا آ رہا ہے: ''اللہ اکبر! اللہ اکبر! ایفاے عہد ہوگا، عہد شکنی نہ ہو گی۔'' وہ حضرت عمرو بن عبسہ تھے۔ حضرت معاویہ نے پچھوایا کہ بدعہدی کا کیا معاملہ ہے؟ حضرت عمرو بن عبسہ نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے، جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو تو مدت معاہدہ ختم ہونے سے پہلے معاہدے میں کوئی کمی بیشی کرے نہ اسے توڑے۔ ہاں معاہد کی طرف سے بدعہدی ہو تو وہ معاہدہ توڑ سکتا ہے۔ حضرت معاویہ نے یہ سنا تو لشکر لے کر واپس چلے گئے (ابوداؤد، رقم ۲۷۵۹۔ ترمذی، رقم ۱۵۸۰۔ احمد، رقم ۱۶۹۵۲)۔

حضرت عمرو بن عبسہ شام میں مقیم رہے اور ۷اھ میں وفات پائی (ابن جوزی)۔ ابن حجر کا خیال ہے کہ ان کا انتقال عہد عثمانی کے اواخر میں حمص میں ہوا۔ تیسری روایت کے مطابق سیدنا عثمان کی شہادت کے وقت حضرت عمرو بن عبسہ زندہ تھے اور انھوں نے حضرت معاویہ، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت ابوالدرداء اور حضرت ابوامامہ کے ساتھ مل کر قاتلین خوارج سے سیدنا عثمان کا قصاص لینے کا مطالبہ کیا۔ ذہبی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت عمرو بن عبسہ کی وفات ۶۰ھ کے بعد ہوئی، البتہ انھیں خود بھی اس تاریخ پر پختہ یقین نہیں۔

اصحاب رجال حضرت عمرو بن عبسہ کو شامی صحابہ میں شمار کرتے ہیں۔ ان کی مرویات صحیح بخاری کے علاوہ ہر کتاب میں ہیں۔ حضرت عمرو نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی، جبکہ ان سے حدیث روایت کرنے والوں میں شامل ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابوامامہ باہلی، حضرت سہل بن سعد ساعدی، حضرت ابورزین لقیط بن صبرہ جیسے جلیل القدر اصحاب رسول اور حضرت ابوادریس خولانی، حضرت عبدالرحمٰن بن عسیلہ صنابحی، حضرت کثیر بن مرہ، حضرت عدی بن ارطاۃ، حضرت شرحبیل بن سمط، حضرت معدان بن ابوطلحہ، حضرت سلیم بن عامر، حضرت ضمرہ بن حبیب، حضرت عبدالرحمٰن بن عامر، حضرت جبیر بن نفیر، حضرت شہر بن حوشب، حضرت عبدالرحمٰن بن بیلمانی، حضرت عبدالرحمٰن بن عائذ، حضرت قاسم بن عبدالرحمٰن اور حضرت ابوسلام اسود جیسے تابعین جن میں سے زیادہ تر شام میں مقیم تھے۔ حضرت بسر بن عبداللہ (یا عبیداللہ)، حضرت حبیب بن عبید، حضرت سوید بن جبلہ، حضرت شداد ابوعمار، حضرت ابوظبیہ (یا ابوطیبہ) کلاعی، حضرت عبدالرحمٰن بن یزید اور حضرت ابوقلابہ جرمی بھی ان کے راویوں میں شامل ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت عمرو بن عبسہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی۔ مال غنیمت کا ایک اونٹ (سترہ کے طور پر) سامنے تھا، سلام پھیرنے کے بعد آپ نے اونٹ کے پہلو سے ایک بال ہاتھ میں لیا اور فرمایا: تمھاری غنیمتوں میں سے میرے لیے اس بال کی مقدار کے برابر لینا بھی جائز نہیں۔ ہاں خمس لے سکتا ہوں اور وہ بھی تم لوگوں ہی میں پلٹ آتا ہے (یعنی مصالح عامہ میں استعمال ہوتا ہے۔ ابوداؤد، رقم ۲۷۵۵۔ مستدرک حاکم، رقم ۶۵۸۳)۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خمس یتیموں اور مساکین میں تقسیم فرما دیتے یا اسلحہ اور فوج کے گھوڑوں کی خریداری میں صرف فرماتے۔

حضرت عمرو بن عبسہ کہتے ہیں: میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا، اسلام کیا ہے؟ فرمایا: اچھی گفتگو کرنا اور کھانا کھلانا۔ پوچھا: ایمان کیا ہے؟ جواب فرمایا: صبر کرنا اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرنا۔ میں نے دریافت کیا: کون سا اسلام افضل ہے؟ تو ارشاد کیا: اس مسلمان کا اسلام جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ سوال کیا: کون سا ایمان افضل ہے؟ جواب فرمایا: جو اچھا اخلاق جنم دے۔ پوچھا: کون سی نماز بہترین ہے؟ آپ نے فرمایا: جس میں دعا لمبی ہو۔ میرا اگلا سوال تھا: کون سی ہجرت بہترین ہے؟ جواب ارشاد ہوا: یہ کہ تو ان سب کاموں کو چھوڑ دے جنھیں تمھارا رب پسند نہیں کرتا۔ میں نے استفسار کیا کہ کون سا جہاد سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے؟ فرمایا: اس مجاہد کا جہاد جس کا خون بہے اور اس کا گھوڑا ہلاک ہو جائے (ابن ماجہ، رقم ۲۷۹۴۔ احمد، رقم ۱۹۳۲۸)۔

مطالعۂ مزید: الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، تاریخ دمشق الکبیر (ابن عساکر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال (مزی)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی) البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، تہذیب التہذیب (ابن حجر)۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

رضوان اللہ

تعدد ازواج کی آیت کا مطالعہ

(۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مذکورہ آیت میں بنیادی طور پر دو چیزیں اور بھی زیر بحث آئی ہیں: ایک تعدد، یعنی کثرت ازواج اور دوسرے اس کے شرائط، یعنی عدل اور تحدید۔ ذیل میں ہم انھیں تفصیل سے دیکھتے ہیں:

تعدد

نکاح کا حکم دیتے ہوئے فرمایا ہے: 'فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا'۔ یعنی ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو۔ پھر اگر ڈر ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو یا پھر لونڈیاں جو تمھارے قبضے میں ہوں۔ یہ اس کے زیادہ قریب ہے کہ بے انصافی سے بچے رہو۔

یہ آیت کا وہ مقام ہے جہاں مفسرین کے ہاں تعدد ازواج کی اصل بحث شروع ہوتی ہے۔ چند باتیں اگر اس کے بارے میں بھی سامنے رہیں تو بہت سی آرا کا اپنے آپ محاکمہ ہو جاتا ہے:

پہلا یہ کہ قرآن میں کثرت ازواج کا حکم ابتداءً نہیں دیا گیا۔ انسانی تاریخ میں اس کا رواج، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا، بہت قدیم زمانے سے شروع ہو گیا تھا۔ اگر بعض الہامی صحائف کی شہادت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کی ابتدا

آدم کی چھٹی نسل کے ایک شخص لمک سے ہوگئی تھی[1]۔ اس لیے یہ کہنا کہ قرآن کی یہ آیت اس کا ماخذ ہے اور اسی سے اس کی ابتدا ہوئی، یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ یہاں فعل امر 'فَانْکِحُوْا'، درحقیقت ایک مسئلے کا تجویز کردہ حل ہے، اس لیے اسے محض اجازت اور اختیار کے مفہوم میں لے لینا ممکن نہیں۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں کہ یتیموں کی بہبود کے لیے تم چاہو تو ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرلو اور چاہو تو نہ کرو یا اگر ایسا کرنا چاہو تو اس معاملے میں تم پر کوئی روک اور پابندی نہیں۔ اس فعل امر کو یہاں حکم ہی کے معنی میں ہونا چاہیے۔ البتہ یہ بات صحیح ہے کہ یہ حکم واجبی نوعیت کا نہیں تھا کہ اس کو مان لینا ہر ایک کے لیے لازم ہوتا، بلکہ یہ لوگوں کو اُس وقت کے حالات میں ایک کارخیر کی ترغیب دینے کے لیے دیا گیا۔

تیسرے یہ کہ 'فَانْکِحُوْا' کا یہ حکم معاشرے میں پہلے سے موجود تعدد ازواج کے رواج سے فائدہ اٹھا لینے کے لیے آیا ہے، اس بارے میں کوئی نیا قانون دینا، یہاں پیش نظر نہیں ہے۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ خدا کا اصل منشا اس رواج کو ختم کرکے صرف ایک عورت سے شادی کا قانون دینا تھا، البتہ اس نے عربوں کے مزاج کی رعایت سے اسے مکمل طور پر ختم نہیں کیا اور اس پر چار کی شرط عائد کردی۔ ہم جانتے ہیں کہ خدا کا منشا معلوم کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ اس کی طرف سے آنے والی وحی اور اس کے الفاظ کی دلالت ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ 'فَانْکِحُوْا' کا لفظ، بلکہ ساری آیت اور یہ پورا سلسلۂ کلام، اس طرح کی کسی بھی دلالت سے یک سر خالی ہیں۔ خدا کے پیش نظر اگر واقعی اس رواج کو ختم کرنا ہوتا تو وہ اس بات کو ایک قانون کی حیثیت سے ذکر کرتا اور یہاں نہیں تو کسی اور مقام پر اس کو ضرور کھول کر بیان کردیتا۔ بالکل اسی طرح، جس طرح اسی آیت میں 'اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ' کے الفاظ میں لونڈیوں کا ذکر آیا ہے، مگر خدا کا ارادہ آخر کار اس رواج کو ختم کردینا تھا، چنانچہ اس نے باقاعدہ قانون کے طور پر اسے ایک جگہ بیان بھی کردیا ہے[2]۔

چوتھے یہ کہ آیت میں جس طرح کسی نئے قانون کی بنیاد نہیں رکھی جارہی، اسی طرح کسی اصل قانون میں سے کوئی استثنا بھی بیان نہیں کیا جارہا۔ چنانچہ یہ بات صحیح نہیں کہ اسلام میں نکاح کے بارے میں اصل قانون ایک مرد اور ایک عورت کی شادی کا ہے اور یہ آیت اس میں سے ایک استثنا کو بیان کررہی ہے۔ قرآن میں کہیں بھی ایک مرد اور ایک عورت کی شادی کا کوئی قانون بیان نہیں ہوا۔ آدم کے لیے ایک حوا کی پیدایش، ایک واقعہ ہے جس سے

---

[1] پیدایش ۴: ۱۹۔

[2] محمد ۴۷: ۴۔

زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں اصل اور مطلوب طریقہ یہی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اس کو قانون کا درجہ دے دینا، قرآن فہمی کی کوئی اچھی مثال نہیں ہے۔

اسی طرح بعض لوگوں کا یہ دعویٰ کرنا بھی صحیح نہیں کہ کثرت ازواج کے لیے جس عدل کی شرط ہے، اس عدل کا واقع ہو جانا ممکن ہی نہیں، جیسا کہ فرمایا ہے: 'وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ'[۳] کہ تم چاہو بھی تو عورتوں کے درمیان میں عدل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ایک سے زیادہ شادی کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ دعویٰ اس لیے صحیح نہیں کہ 'وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا' کی آیت کثرت ازواج کے لیے مطلوب عدل کے امکان کی نفی نہیں کر رہی، بلکہ اس کے حدود کی وضاحت کر رہی ہے۔ اس میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ دلی جذبات اور ظاہر کے برتاؤ میں ترازو کی تول برابری ہو جائے، یہ ممکن نہیں اور نہ کسی سے اس کا تقاضا کیا گیا ہے۔ بلکہ مطلوب صرف یہ ہے کہ ایک بیوی کی طرف اس درجہ جھکاؤ نہ ہو کہ دوسری بیوی ایک عضو معطل ہو کر رہ جائے۔ پھر یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ ایک سے زیادہ عورتوں میں خدا عدل کی شرط رکھے اور پھر ہمیں خود یہ بھی بتا دے کہ تم اس عدل کی طاقت نہیں رکھتے تو کیا اس کے باوجود وہ ہمیں ایک سے زیادہ شادی کرنے کا حکم دے سکتا ہے، جیسا کہ زیر بحث آیت میں اس نے دیا ہے۔

پانچویں یہ کہ تعدد کا یہ معاملہ اپنی اصل میں جائز ہے اور کچھ خاص قسم کے حالات کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں کہ وہ حالات ہوں تو اس پر عمل جائز ہو، وگرنہ ناجائز ہو۔ لہٰذا بعض حضرات کا یہ کہنا درست نہیں کہ یہ حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ عرب کے پدرسرانہ معاشرے میں عورت کے لیے مرد ہی کفالت کا واحد ذریعہ تھا، وہ بالغ ہو تو خاوند کی صورت میں اور اگر نابالغ ہو تو باپ کی صورت میں۔ تمدن کی ترقی کی وجہ سے چونکہ اس قسم کے معاشرے ناپید ہو گئے ہیں، اس لیے تعدد ازواج کا جواز بھی اب ختم ہو گیا ہے۔ یاد رہنا چاہیے کہ جو معاملہ اپنی اصل میں مباح ہے، کچھ خاص حالات کی وجہ سے اس پر عمل کرنا مستحب اور بعض اوقات واجب بھی ہو سکتا ہے، مگر اس کی اباحت ان حالات پر ہی موقوف قرار پائے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ طبیب کسی مریض کو دودھ پینے کا مشورہ دے یا اس کی تاکید کرے، اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ مریض جب صحت یاب ہو جائے تو یہ دودھ اس کے لیے جائز نہ رہے۔ چنانچہ آیت کے بارے میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ کثرت ازواج کا یہ حکم خاص حالات میں دیا گیا، اس اعتبار سے یہ حکم وقتی اور عارضی تھا، مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بذات خود کثرت ازواج کا جواز وقتی اور عارضی تھا۔ غرض یہ کہ قرآن کے زمانے جیسے حالات دوبارہ سے پیدا ہو جائیں اور اگر اس کا امکان نہیں تو کچھ اور ناگزیر ضرورتیں لاحق ہو جائیں یا سرے سے کوئی

۳؎ النساء ۴: ۱۲۹۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مسئلہ بھی نہ ہو، ان تمام صورتوں میں تعدد ازواج پر عمل کرنا بالکل جائز ہے اور وجہ اس کی یہی ہے کہ یہ اپنی اصل میں مباح ہے اور کوئی شرعی مانع اس میں موجود نہیں۔

عدل اور تحدید

کثرت ازواج کا جواز قرآن میں دو شرطوں کے ساتھ بیان ہوا ہے: ایک عورتوں کے درمیان میں عدل کرنا اور دوسرا ان عورتوں کی تعداد کا چار میں مقید ہونا۔ اس میں سے عدل پر تو کسی بحث کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ یہ دین اور اخلاق کا بنیادی مسلمہ ہے اور اس میں کسی اختلاف کی کوئی گنجایش نہیں، مگر تحدید کے بارے میں زیر بحث آیت کے یہ الفاظ ضرور قابل مطالعہ ہیں: 'مَثۡنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ'۔ یعنی دو دو، تین تین اور چار چار سے نکاح کرلو۔

ان الفاظ کے بارے میں بعض لوگوں کی رائے ہے کہ یہاں دو دو، تین تین اور چار چار سے مقصود کوئی خاص عدد نہیں ہے کہ ان کی تحدید کا سوال پیدا ہو۔ یہ ایسا ہی اسلوب ہے جیسے ہم کہیں کہ اس کتاب کو دو چار مرتبہ پڑھو گے تو پھر اس کے مطالب کو جان پاؤ گے۔ یہ بات صحیح ہے کہ عربی زبان میں بھی اعداد اپنے مجازی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، جیسے سات کا ہندسہ اپنے حقیقی معنی میں بھی ہوسکتا ہے اور مجازی معنی میں بھی، تاہم اس میں چند باتوں کا خیال رہنا چاہیے: ایک یہ کہ اس کے مجاز یا حقیقت ہونے کا فیصلہ خود وہ کلام کرتا ہے جس میں یہ استعمال ہوتے ہیں۔ دوم یہ کہ عربی زبان میں جب یہ مجازی معنی میں ہوں تو بالعموم مرکب کے بجائے مفرد کی صورت میں آتے ہیں، جیسے سات، ستر اور ہزار۔ سوم یہ کہ یہاں 'مَثۡنٰی وَثُلٰثَ' تک بات ختم ہو جاتی تو کسی درجے میں اس کو مجاز مانا جا سکتا تھا، لیکن اس کے بعد 'رُبٰعَ' کا استعمال اس بات میں مانع ہے کہ اس کو مجاز کے معنی میں لیا جائے۔ غرض یہ کہ یہ اسلوب اپنے حقیقی معنی میں ہے اور اس پر دلیل مزید کے لیے قرآن کا وہ مقام بھی کفایت کرتا ہے جس میں فرشتوں کے لیے انھی الفاظ میں ارشاد ہوا ہے: 'اُولِیۡۤ اَجۡنِحَۃٍ مَّثۡنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ'، یعنی یہ فرشتے دو دو پروں والے بھی ہیں اور تین تین اور چار چار پروں والے بھی[۴]۔ اور ظاہر ہے، یہ الفاظ ان کے پروں کی متعین تعداد ہی کو بیان کر رہے ہیں۔

یہ مان لینے کے بعد کہ آیت میں اعداد اپنے حقیقی معنوں میں ہیں، اس بات میں پھر اختلاف ہے کہ یہ ہیں کتنے۔

---

[۴] فاطر ۳۵:۱۔ یہاں اُس شبہے کا بھی ازالہ ہو جانا چاہیے کہ اصل میں 'یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ' کے الفاظ ہیں جو مذکورہ اعداد کے حقیقی ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ دلیل صحیح ہوسکتی تھی اگر یہ جملہ صرف فرشتوں کے پروں کے بارے میں آیا ہوتا، دراں حالیکہ ایسا نہیں ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بعض لوگوں کے نزدیک یہاں واؤ جمع کے لیے آیا ہے، اس لیے مراد ان تینوں کا مجموعہ ہے۔ یعنی لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ نو عدد عورتوں سے نکاح کر لیں کہ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نو نکاح کیے۔ بعض لوگ اس سے بھی تجاوز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آیت میں اٹھارہ عورتوں سے نکاح کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے کہ 'مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ' یہاں معدول ہو کر آئے ہیں اور 'مَثْنٰی' سے مراد دو نہیں، بلکہ دو دو ہیں اور اسی طرح دیگر اعداد کا معاملہ ہے۔ اس کے جواب میں عرض ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو صاف طور پر بتا دیا گیا ہے کہ یہ اجازت صرف اور صرف آپ کے ساتھ خاص ہے، اس لیے اس کو دلیل بنا لینا ممکن نہیں[5]۔ پھر واؤ بھی یہاں جمع کے لیے نہیں، بلکہ بدل کے طور پر آئی ہے۔ مطلب یہ کہ تم میں سے کوئی دو سے، کوئی تین سے اور کوئی چار سے نکاح کر لے۔ اس لیے کہ اہل عرب نو یا اٹھارہ کہنا چاہیں گے تو وہ اس کے لیے اعداد کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اور پھر واؤ جمع لا کر کبھی بھی بیان نہیں کریں گے۔ مزید یہ کہ قرآن کا مدعا بھی اگر یہی ہوتا تو وہ سیدھا نو یا اٹھارہ کا ہندسہ استعمال کر دیتا، یوں حساب کا سوال بنا کر پیش کرنے کی آخر اس کو ضرورت کیا تھی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہاں ایک نکتہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ مان لیا کہ ان الفاظ سے مراد دو سے چار تک کے اعداد ہیں، مگر کیا اس سے یہ لازم بھی آتا ہے کہ متکلم کے پیش نظر چار تک کی تحدید کرنا ہے۔ وہ ایک بھلائی کے کام کی ترغیب دے رہا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کہا جائے کہ خدا کی راہ میں فقیروں کو دو دو تین تین چار چار روپے دے دو۔ اب ظاہر ہے اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ کوئی پانچ روپے نہ دے۔ بلکہ کلام کا سیاق مدنظر رہے تو زیادہ سے زیادہ دینا متکلم کا مطلوب سمجھا جاتا ہے۔ اس نکتے کے جواب میں جن علما کی رائے یہ ہے کہ اسلام میں کثرت ازواج کا جواز بے حد وحساب نہیں، بلکہ اس میں چار تک کا حصر پایا جاتا ہے، انھوں نے مختلف طریقوں سے اس حصر کو ثابت کیا ہے:

بعض علما کا کہنا ہے کہ قرآن میں چاہے تعدد ازواج کی تحدید نہیں ہوئی، لیکن سب فقہا کا اس پر اجماع ہو جانا، یہی اس کی دلیل ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعدد ازواج اگر اپنی اصل میں جائز ہے اور خدا اور رسول نے بھی اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی تو کیا علما کا اجماع یہ حیثیت رکھتا ہے کہ اس کو شارع قرار دے دیا جائے اور صرف اسی بنا پر اس میں تحدید کو مان لیا جائے۔ ظاہر ہے خدا کو شارع اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شارح ماننے والا اور صرف قرآن وسنت کو دین کا ماخذ قرار دینے والا کوئی بھی شخص اس بات سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔

بعض حضرات کے نزدیک یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول کچھ روایات ہیں جو چار تک کے حصر کو بیان کرتی

۵۔ الاحزاب ۳۳: ۵۰۔

ہیں۔ ایک شخص کو جس کی دس بیویاں تھیں، آپ نے فرمایا کہ ان میں سے چار کو اپنے ساتھ رکھ لو اور باقی چھ کو چھوڑ دو[6]۔ اسی طرح ایک شخص کی پانچ اور ایک کی آٹھ بیویاں تھیں، انھیں بھی آپ نے چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی[7]۔ ان روایات کی بنیاد پر بھی حصر کے استدلال کو مان لینا اتنا آسان نہیں۔ اس لیے کہ روایات کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ یہ بالعموم شرعی احکام کے اطلاقات کو بیان کرتی ہیں جو قرآن مجید یا پھر سنت میں پہلے سے موجود ہوتے ہے۔ مثال کے طور پر، ایک شخص مسلمان ہوا اور اس کے عقد میں دو سگی بہنیں تھیں۔ آپ نے اس سے بھی یہی فرمایا: 'إختر أيتهما شئت[8]'، یعنی ان میں سے کسی ایک کو ساتھ رکھو اور دوسری کو طلاق دے دو۔ ظاہر ہے یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی مستقل بالذات حکم نہیں دے رہے، بلکہ قرآن مجید میں موجود 'وَاَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَيۡنَ الۡاُخۡتَيۡنِ' کے حکم کا اطلاق فرما رہے ہیں[9]۔ بالکل اسی طرح ان تحدید بیان کرنے والی روایات کا معاملہ ہے، یہ بھی لازماً کسی نہ کسی حکم شرعی کا اطلاق ہی بیان کر رہی ہیں۔ لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ حکم شرعی کہاں مذکور ہوا ہے کہ جس پر یہ روایات مبنی ہیں۔ اس کے جواب میں ہماری طالب علمانہ رائے یہ ہے کہ وہ حکم شرعی قرآن ہی میں مذکور ہوا ہے اور اس بات کی تفصیل کچھ یوں ہے:

آیت میں 'مَثۡنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ' کے الفاظ اپنی نحوی تالیف کے لحاظ سے حال واقع ہوئے ہیں۔ حال کسی نہ کسی عامل کا تقاضا کرتا ہے اور وہ عامل یہاں فعل امر 'فَانۡكِحُوۡا' ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جس حال کا عامل فعل امر حقیقی ہو تو وہ معنوی اعتبار سے شرط کے مفہوم میں ہوتا ہے[10]۔ چنانچہ اس آیت کا ٹھیک لفظی ترجمہ یہ ہوگا: تم ان عورتوں میں سے جن کو موزوں خیال کرو، نکاح کر لو، شرط یہ ہے کہ وہ دو دو ہوں، تین تین ہوں اور چار چار ہوں۔ گویا اس میں تعدد ازواج کا صرف حکم بیان نہیں ہوا، بلکہ یہ چار تک کی تحدید کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی آیت کا یہی حصر ہے کہ جس کا اطلاق آپ نے مختلف موقعوں پر فرمایا ہے۔

6۔ موطا مالک، رقم ۲۱۷۹۔

7۔ شرح السنۃ، رقم ۲۲۸۹، ابوداؤد، رقم ۲۲۴۱۔

8۔ ترمذی، رقم ۱۱۲۹۔

9۔ النساء ۴: ۲۳۔

10۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن میں کئی جگہ پر دیکھی جا سکتی ہیں، جیسے: 'فَانۡكِحُوۡهُنَّ بِاِذۡنِ اَهۡلِهِنَّ ..... مُحۡصَنٰتٍ' (النساء ۴: ۲۵)، 'وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ فِىۡ نَفۡسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيۡفَةً' (الاعراف ۷: ۲۰۵) اور 'وَادۡعُوۡهُ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ' (الاعراف ۷: ۲۹) وغیرہا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دوسرے یہ کہ یہاں تعدد ازواج کی ترغیب یتیموں کی فلاح و بہبود کی خاطر دی گئی ہے۔ اس کی رعایت رہے تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آیت میں زیادہ سے زیادہ نکاح کرنے کی ترغیب دی جاتی۔ اس کو بیان کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ نکاح کرو، یا اسی طرح کے کچھ الفاظ ہوتے۔ یا پھر عدد کا ذکر ہی نہ ہوتا، محض نکاح کرنے کا حکم ہوتا اور ہر کوئی اپنی استطاعت کے مطابق نکاح کر لیتا، جیسا کہ مثال کے طور پر انفاق کی ترغیب دیتے ہوئے جگہ جگہ اس اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کچھ اعداد کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے باوجود کہ عرب معاشرے میں چار سے زائد شادیوں کا رواج معمول کی بات تھی اور اس کے باوجود کہ بہت سے لوگ اس کے لیے درکار وسائل بھی فراہم کر سکتے تھے۔ سو کچھ مخصوص اعداد کا ذکر کرنا، اس بات کی بین دلیل ہے کہ متکلم کے پیش نظر یہاں کثرت ازواج میں تحدید کو بطور شرط بیان کرنا مقصود ہے۔

تیسرے یہ کہ آیت میں فرمایا ہے: 'فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً'۔ یعنی اگر ڈرو کہ تم دو، تین اور چار بیویوں میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو۔ ان لفظوں سے بالبداہت معلوم ہوتا ہے کہ یہ مان لیا گیا ہے کہ چار تک میں عدل کیے جانے کا امکان ضرور پایا جاتا ہے۔ دوسری جگہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چار سے زائد شادیوں کی اجازت دی گئی تو وہاں عدل کی شرط کو ساقط کر دیا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار سے زائد شادیوں میں عدل کا امکان نہیں مانا گیا[11]۔ ان دونوں باتوں کا یہ بدیہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آیت مذکورہ میں عدل چونکہ شرط کے طور پر آیا ہے، اس لیے اب چار سے زائد نکاح کرنا ممنوع قرار پا گیا ہے۔

چوتھے یہ کہ چار تک کی اس تحدید پر قرآن نے ایک اور طریقے سے بھی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ سورۂ احزاب میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نکاح کے باب میں بعض خصوصی احکامات نازل ہوئے تو اس میں بنیادی طور پر دو ہی باتیں فرمائی گئیں: ایک یہ کہ آپ پر چار سے زائد نکاح کر لینے میں کوئی پابندی نہیں اور دوسری یہ کہ عدل کی شرط بھی بعض وجوہات کی بنا پر اب آپ پر قائم نہیں رہی۔ الفاظ یہ ہیں: 'خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ، قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ[12]'۔ ظاہر ہے، اس کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ عام لوگوں کے نکاح میں یہ دونوں چیزیں شرط کے طور پر موجود ہیں۔

۱۱؎ الاحزاب ۳۳: ۵۱۔

۱۲؎ الاحزاب ۳۳: ۵۰۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ڈاکٹر خالد ظہیر
ترجمہ: رانا معظم صفدر

کیا مغرب مسلمانوں کے لیے دارالحرب ہے؟

[یہ ڈاکٹر خالد ظہیر کے انگریزی مضمون ''Is the west Dar-ul-Harb for Muslims?'' کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ مضمون ۱۳/ اپریل ۲۰۱۱ کو انگریزی روزنامہ ''Dawn'' میں شائع ہوا تھا۔ جناب رانا معظم صفدر صاحب نے اسے انگریزی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بعض مسلمانوں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ مسلم اقلیت والے ممالک، خاص طور پر جہاں کے حکمران غیر مسلم ہوں، ان ممالک کی حیثیت مسلمانوں کے لیے دارالحرب کی ہے ـــــ دارالحرب سے مراد ایسا ملک ہوتا ہے جو مسلمانوں سے جنگ کر رہا ہو ـــــ لہٰذا مسلمانوں کو ان کے ساتھ خود کو حالت جنگ میں سمجھنا چاہیے۔

مسلمانوں میں یہ تصور فقہ سے آیا ہے۔ فقہ سے مراد اسلام کی وہ قانونی شرح و وضاحت ہے جو دور اول کے فقہاے کرام نے اس زمانے میں کی تھی۔ اس کے مطابق جو تصور وجود پذیر ہوا، اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اسلام کو بالآخر روے زمین پر، یعنی تمام مذاہب اور تمام ممالک پر غالب آنا ہے۔ یہ تصور دو وجوہ سے قائم ہوا ہے: پہلی وجہ قرآن مجید کی بعض آیات ہیں جن سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اسلام کو تمام مذاہب و ممالک پر غالب آنا ہے اور دوسری وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلے دور کے مسلمانوں کا طرز عمل ہے۔ وہ اسلام کا پیغام تین شرائط کے ساتھ غیر مسلم علاقوں میں دیتے تھے:

۱۔ اسلام قبول کر دیا

۲۔ ہماری حکومت کے تحت آ کر جزیہ دو یا

۳۔ جنگ کرو۔

اب صورت حال یہ ہے کہ اس تصور کو صحیح سمجھنے والے لوگوں کا یہ یقین ہے کہ ان کے ایمان کا ان سے یہ تقاضا ہے کہ اگر وہ مطلوبہ طاقت پا لیتے ہیں تو وہ غیر مسلم علاقوں پر حملے کریں۔ ان کے مطابق یہ دنیا جس میں ہم اس وقت رہ رہے ہیں، اسی صورت میں پر امن ہو سکتی ہے، جب اس تصور کا زیادہ سے زیادہ پرچار کیا جائے اور اس کے ہم خیال لوگ اکٹھے کیے جائیں اور پھر ان کے ذریعے سے ایک ایسی عظیم مسلم خلافت قائم کی جائے کہ پوری دنیا اس کے زیر نگیں آ جائے۔ جب تک ایسا نہیں ہو جاتا عالمی امن قائم نہیں ہو سکتا اور یہ دنیا مسلموں اور غیر مسلموں کی لڑائی کی وجہ سے حالت جنگ میں رہے گی۔ اس تصور کو ثابت کرنے کے لیے قرآن مجید کی درج ذیل آیت بیان کی جاتی ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ. (الصّف ۶۱:۹)

''وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تا کہ اس کو غالب کرے تمام دینوں پر اگرچہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس آیت کو اگر قرآن کے مکمل پیغام کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ ایک حقیقت کو بیان کر رہی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ویسا ہی پیغام دیا جو آپ سے پہلے رسولوں کو دیا۔ آیت کا مدعا یہ ہے کہ جزیرہ نماے عرب میں پائے جانے والے تمام ادیان پر اللہ کا پیغام غالب ہوگا۔

درحقیقت، یہ آیت عام مسلمانوں سے متعلق نہیں ہے کہ وہ زبردستی اللہ کے پیغام کو پوری دنیا کے ادیان پر نافذ کریں۔ اس کے بجاے یہ آیت پڑھنے والوں کو محض یہ خبر دے رہی ہے کہ اللہ کی منشا پوری ہونے جا رہی ہے۔ یعنی یہ آیت کوئی ایسا حکم نہیں دے رہی کہ ہر زمانے کے مسلمان اس کی پیروی کے پابند ہوں۔ اس کے بجاے یہ ایک حقیقت واقعہ کی پیشین گوئی ہے، جو آیت کے نزول کے کچھ ہی عرصہ بعد پوری ہوگئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زندگی کے آخری حصے میں یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور جزیرہ نماے عرب پر اسلام کا پیغام غالب آ گیا۔ آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد آپ کے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم نے آگے بڑھ کر اللہ کی منشا کو گردوپیش کے علاقوں میں بالکل اسی طرح نافذ کیا جیسا کہ آپ کی حیات مبارکہ میں آپ کی طرف سے آپ کے اپنے علاقے میں کیا گیا۔ یہ بھی واضح رہے کہ وہ اقوام جو جزیرہ نماے عرب اور اس کے گردونواح میں آباد تھیں، وہ اس حقیقت سے باخبر تھیں کہ ایک ایسے پیغمبر کی بعثت ہو چکی ہے جس کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ مزید یہ کہ جس انقلاب کا قدیم صحائف میں وعدہ کیا گیا تھا، وہ حقیقت ہے۔ مسلم فوجوں نے ان تمام علاقوں میں پیش قدمی کی جن

کے حکمرانوں کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام بھیجا تھا۔

دوسرے الفاظ میں، صحابہ کرام نے گردوپیش کے علاقوں میں سیاسی برتری کے ذریعے سے جو حکمرانی قائم کی، وہ رسول اللہ کے اس مشن کی توسیع تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے انھیں مامور فرمایا تھا۔ اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ بعد کے زمانوں کے مسلمان بھی اس طرز عمل کو اختیار کریں۔ اگر اسی طرز عمل کو جاری رکھا گیا کہ پوری دنیا مسلمانوں کے زیرنگیں ہو تو اسلام جو کہ امن کا پیغام ہے عملاً جنگ اور خون ریزی کا پیغام ثابت ہوگا، اور یہ اپنے اس دعویٰ کی تردید ہو گا جو وہ اپنے بارے میں کرتا ہے کہ وہ پوری انسانیت کے لیے رحمت ہے۔

ایسی آیات کی منطقی اور قابل فہم وضاحت یہی ہے کہ یہ غلبۂ اسلام کے پیغام کو بیان کرتی ہیں۔ ان آیات میں اللہ کے اس قانون کا ذکر ہے جو رسولوں کے بارے میں ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول اپنے دشمنوں پر ہمیشہ غالب رہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ. (المجادلہ ۵۸:۲۱)

''اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول بھی۔ بے شک، اللہ قوی ہے، بڑا زبردست ہے۔''

ان آیات کا اطلاق —— اپنے اسلوب بیان اور سیاق کلام کی وجہ سے —— رسول اللہ کے زمانے کے ساتھ خاص ہے۔ لہٰذا بعد کے زمانوں کے غیر مسلم ممالک مسلمانوں کے لیے دار الحرب نہیں ہیں، بلکہ دار الدعوۃ ہیں، یعنی ان ممالک کے شہریوں کو اسلام کے پیغام کی دعوت دینے کی ضرورت ہے۔

مغربی ممالک میں قیام پذیر مسلمان اقلیتی شہری ہیں اور ان سے یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ قانون پر عمل کرنے والے اور اپنی ذمہ داریوں کو تندہی سے سرانجام دینے والے بنیں۔ لہٰذا انھیں چاہیے کہ وہ ان ممالک کے رہنے والوں کو اپنے دشمن کی حیثیت سے دیکھنے کے بجاے انھیں اپنے دوست کے طور پر دیکھیں اور ان پر اپنے اچھے رویے سے مثبت اثرات مرتب کریں تاکہ انھیں اسلام کے پیغام کے قریب لانے کی راہ ہموار ہو سکے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امین احسن اصلاحی

شوریٰ سے متعلق دو اہم سوال

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سوال: کتاب وسنت کی تصریحات سے یہ امر بخوبی ثابت ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام شورائی نوعیت کا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر وضاحت طلب ہے کہ شوریٰ کی نوعیت کیا ہوگی یعنی:

۱۔ کیا ارکان شوریٰ کی تعیین ثابت ہے یا امیر جس سے چاہے مشورہ کر لے۔

۲۔ کیا امیر مجلس مشاورت کے ارکان کی اکثریت کے فیصلہ کا پابند ہوگا؟

امید ہے کہ جناب اولین فرصت میں ان سوالات پر روشنی ڈالیں گے۔

جواب: ۱۔ اسلام میں جس شوریٰ کا حکم دیا گیا ہے، اس کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ امیر جس راہ چلتے سے چاہے مشورہ کر لے، بلکہ قرآن وحدیث میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ انھی لوگوں سے مشورہ کیا جائے جو امت کے اندر اجتہاد واستنباط کی صلاحیت رکھنے والے ہیں، جن کی حیثیت ارباب حل وعقد اور اولوالامر کی ہے اور جو علم اور تقویٰ کی صفات سے متصف ہیں۔

یہ صفتیں لفظاً بھی قرآن وحدیث میں وارد ہوئی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین نے عملاً بھی ان صفات کو اہل شوریٰ میں ملحوظ رکھا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق شوریٰ کے جتنے واقعات ملتے ہیں، ان سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ آپ قابل مشورہ امور میں انھی لوگوں کو مقدم رکھتے تھے جو علم، راے اور لوگوں کے اعتماد کے پہلو سے فوقیت رکھنے والے ہوتے تھے۔ کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ اہل الراے اور اصحاب اعتماد کو تو نظر انداز کر دیا ہو اور کسی عام آدمی سے مشورہ کر کے کسی قابل مشورہ امر کا فیصلہ کر

دیا ہو۔

ٹھیک یہی طریقہ حضرات خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کا تھا۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر، دونوں بزرگوں کا طریقہ یہ رہا ہے کہ جب کوئی اہم معاملہ قابل مشورہ سامنے آتا تو انصار و مہاجرین کے لیڈروں اور ان کے اصحاب علم کو بلاتے اور ان سے مشورہ حاصل کرتے۔ انصار و مہاجرین اس زمانہ میں پورے سواد امت کی رہنمائی کرتے تھے اور مدینہ منورہ ان سب کا مرکز تھا۔ ہجرت کے حکم نے تمام مسلمانوں کو وہاں اس طرح جمع کر دیا تھا کہ مدینہ سے باہر صرف وہی لوگ ہوتے جو یا تو جنگ و جہاد کے مقصد سے نکلے ہوئے ہوتے یا حکومت کی کسی دوسری اہم خدمت کے لیے بھیجے جاتے۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں سے مشورہ کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ البتہ جو اہل الراے مدینہ میں موجود ہوتے، وہ ضرور بلائے جاتے۔ بس اتنا فرق ہوتا کہ اگر کوئی بڑی اہمیت رکھنے والا معاملہ ہوتا تو انصار و مہاجرین اور قبائل کے سارے ہی قابل ذکر لوگ جمع کیے جاتے، ورنہ صرف خاص خاص لیڈروں سے ہی مشورہ کر لیا جاتا۔ یہ محض اس اعتماد پر کہ معاملہ ایسا سنگین نہیں ہے کہ دوسروں کو اگر نہ بلایا گیا تو اس سے ان کے اندر کوئی بے اعتمادی یا شکایت پیدا ہوگی۔

یہ ارباب حل و عقد یا اصحاب الراے جن کو شریک مشورہ کیا جاتا، اگرچہ موجودہ سیاسی مفہوم میں قوم کے منتخب نمایندے نہیں ہوتے تھے، اس لیے کہ اس زمانہ میں انتخابات کا موجودہ طریقہ روشناس نہیں ہوا تھا، لیکن یہ لوگ اپنے اپنے گروہوں کے معتمد نمایندے ضرور ہوتے تھے۔ ان کے معتمد ہونے کی دلیل یہ ہوتی تھی کہ ان گروہوں کے لوگ اپنے معاملات میں انھی کی طرف رجوع کرتے تھے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اہل عرب جاہلیت میں چونکہ قبائلی زندگی کے عادی تھے، اس وجہ سے ان کے لیے لیڈر کے بغیر زندگی بسر کرنا ناقابل تصور تھا۔ اسلام کے بعد قیادت کے متعلق ان کے اقدار اور پیمانے تبدیل ہو گئے، لیکن ہر گروہ نے اپنی یہ روایت باقی رکھی کہ اس کا کوئی نہ کوئی معین لیڈر ضرور ہو۔ چنانچہ جس طرح وہ جاہلیت میں اپنے معین لیڈروں کی رہنمائی اور ان کے مشوروں کی پابندی کرتے تھے، اسی طرح اسلام میں بھی وہ اس روایت کے پابند رہے۔ بس فرق اگر ہوا تو یہ ہوا کہ جاہلیت میں ان کے لیڈر ابولہب اور ابوجہل کے قسم کے لوگ ہوتے تھے، اسلام میں آکر ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم کے قسم کے لوگ ہونے لگے۔

یہی لوگ تھے جن سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی عام اہمیت کے معاملات میں مشورے فرماتے تھے اور انھی سے حضرات شیخین بھی مشورے کرتے تھے۔ ان لوگوں کو کسی مشورہ میں نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا، الاّ آنکہ معاملہ کوئی

عمومی اہمیت رکھنے والا نہ ہو یا اہمیت رکھنے والا تو ہو، لیکن اس کی نوعیت ایسی ہو کہ صرف مخصوص اصحاب علم وفن ہی اس کے بارے میں کوئی مشورہ دے سکتے ہوں۔ اس وجہ سے میں یہ تو قطعی راے رکھتا ہوں کہ حضرات شیخین کے زمانہ میں اہل شوریٰ بالکل متعین تھے۔ البتہ یہ ضرور ہوتا رہا ہے کہ معاملات کی نوعیت کے لحاظ سے، جیسا کہ عرض کیا گیا، کبھی تمام نمایندے بلائے جاتے اور کبھی صرف چوٹی کے خاص خاص لوگوں ہی سے مشورہ کر لیا جاتا۔ حضرت عمر کے زمانہ میں تو بڑی اور چھوٹی دو الگ الگ کونسلیں موجود تھیں جن کے ارکان کے نام الگ الگ مولانا شبلی نے ''الفاروق'' میں گنائے ہیں اور اس باب میں جو کچھ لکھا ہے، اپنی عادت کے مطابق مستند حوالوں سے لکھا ہے۔ آپ ''الفاروق'' اور حاجی معین الدین صاحب کی ''خلفائے راشدین'' میں متعلقہ ابواب پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

۲۔ میں اس امر میں بھی بالکل یکسو ہوں کہ امیر کے لیے مجلس شوریٰ کی اکثریت کے فیصلوں کی پابندی ضروری ہے۔ اس کی اول دلیل تو وہی ہے جو صاحب ''احکام القرآن'' ابو بکر جصاص نے دی ہے کہ یہ شوریٰ کی فطرت کا اقتضا ہے کہ اہل شوریٰ کی اکثریت کے فیصلہ کو تسلیم کیا جائے، اس لیے کہ یہ بات بالکل بے معنی سی معلوم ہوتی ہے کہ اسلام میں شوریٰ کا حکم تو اس شد و مد سے دیا جائے اور مقصود صرف یہ ہو کہ چند لوگوں کو شریک مشورہ کر کے ذرا ان کی دل داری اور عزت افزائی کر دی جائے، امیر کے لیے ان کے مشوروں کی پابندی ضروری نہ ہو۔ صاحب ''احکام القرآن'' کے نزدیک یہ شکل لوگوں کی دل داری اور عزت افزائی کی نہیں، بلکہ الٹا ان کی دل شکنی اور توہین کے مترادف ہے۔

دوسری دلیل اس کی یہ ہے کہ ایک شخص کے مقابل میں ایک جماعت کی راے بہر حال اپنے اندر صحت و اصابت کے زیادہ امکانات رکھتی ہے، اس وجہ سے عقل و فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ امیر اپنی تنہا راے کے مقابل میں یا اپنے چند ہم خیالوں کی راے کے مقابل میں اکثریت کی راے کو رد نہ کرے۔ آخر ایک اجتہادی یا مصلحتی معاملہ میں اس کو یہ علم کس طرح ہوا کہ اس کی راے صحیح اور دوسروں کی راے غلط ہے۔ صحت اور غلطی کا امکان دونوں طرف ہے، لیکن صحت کا غالب امکان اس طرف ہے جدھر اکثریت ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر فرد کے مقابل میں جمہور کے مسلک اور انفرادی اجتہاد کے بالمقابل اجماع کو شریعت میں ترجیح دی گئی ہے۔

اس کی تیسری دلیل یہ ہے کہ خلفاے راشدین کے زمانہ کی کوئی ایک مثال بھی ہمارے سامنے ایسی نہیں ہے جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ انھوں نے کسی قابل مشورہ امر میں لوگوں سے مشورہ کیا ہو اور پھر ان کے متفق علیہ مشورہ یا ان کی اکثریت کی راے کے خلاف قدم اٹھایا ہو۔ خلفاے راشدین تو درکنار خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آپ نے بھی جس معاملہ میں لوگوں سے مشورہ لیا، اس میں اکثریت

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے فیصلہ کے مطابق ہی عمل کیا۔ کوئی ایک مثال بھی اس کی خلاف ورزی کی حضور سے منقول نہیں ہے، حالاں کہ حضور نہ تو کسی معاملہ میں لوگوں کے مشورہ کے محتاج تھے اور نہ کسی مشورہ کی پابندی آپ کے لیے لازمی قرار دی جا سکتی تھی۔

صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی سے دو واقعے ایسے پیش کیے جاتے ہیں جن سے بعض حضرات یہ استدلال کرتے ہیں کہ امیر اپنی تنہا راے کے ذریعہ سے اہل شوریٰ کے متفقہ فیصلہ یا ان کی اکثریت کی راے کو رد (VETO) کر سکتا ہے۔ ایک حضرت ابوبکر کا موقف مانعین زکوٰۃ سے جنگ کے معاملہ میں، دوسرا لشکر اسامہ کی روانگی کے معاملہ میں، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ان دونوں مواقع پر حضرت ابوبکر نے جو موقف اختیار فرمایا، اس کو عام طور پر غلط سمجھا گیا ہے، اس وجہ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ میں یہاں ان کے موقف کی وضاحت کر دوں۔

پہلے مانعین زکوٰۃ کے معاملہ کو لیجیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب کے جو قبائل مرتد ہو گئے تھے، ان میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو کہتے تھے کہ ہم نماز تو پڑھیں گے، لیکن زکوٰۃ نہیں ادا کریں گے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کو بہ زور شمشیر ادائیگی زکوٰۃ پر مجبور کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ معاملہ ان کے نزدیک شریعت کے ان واضح اور منصوص مسائل میں سے تھا جن کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس وجہ سے اس میں انھوں نے شوریٰ سے مشورہ حاصل کرنے کا اپنے کو پابند نہیں سمجھا، بلکہ روزہ، نماز، حدود، تعزیرات اور اس قسم کے دوسرے مسائل کی طرح اس میں بہ حیثیت خلیفہ اپنی ذمہ داری خدا کے قانون کی تنفیذ سمجھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اسی نقطۂ نظر کے مطابق یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر یہ اسلامی بیت المال کو زکوٰۃ ادا نہ کریں تو ان کو طاقت کے زور سے اطاعت پر مجبور کیا جائے۔

جب لوگوں کو ان کے اس فیصلہ کا علم ہوا تو کچھ لوگوں نے ان سے کہا کہ ابھی اسلام کا معاملہ نیا نیا ہے، مخالفین کی تعداد زیادہ ہے اور ہم تھوڑے ہیں، بہ یک وقت سارے عرب کا مقابلہ مشکل ہو گا۔ اس وجہ سے بہتر ہو گا کہ اگر یہ لوگ نماز کا اقرار کرتے ہیں تو صرف زکوٰۃ کے لیے ان سے جنگ نہ کی جائے، بلکہ جس حد تک بھی یہ دین کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہیں، اسی پر قناعت کر لی جائے۔ ان لوگوں نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں ایک حدیث بھی پیش کی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ 'أمرت أن أقاتل الناس حتٰی یقولوا لا إله إلا اللّٰه فإذا قالوها عصموا منی دِماءهم وأموالهم إلا بحقها وحسابهم علی اللّٰه'* (مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں، یہاں تک کہ وہ لا الٰہ کا اقرار کریں، جب وہ اس کا اقرار کر لیں گے تو ان کی جانیں اور ان کے مال میری طرف سے محفوظ ہو جائیں گے، مگر اسی کلمہ کے کسی حق کے تحت اور ان کے باطن کا محاسبہ اللہ کے ذمہ ہے)

* ترمذی، رقم ۳۳۴۱۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت ابوبکر نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ زکوٰۃ تو اس کلمہ کے حقوق میں شامل ہے اس وجہ سے ان لوگوں سے جنگ ناگزیر ہے۔

جب لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے فیصلہ پر بالکل عازم پایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ وہ اس معاملہ میں حضرت ابوبکر سے گفتگو کریں۔ جب حضرت عمر نے گفتگو کی تو حضرت ابوبکر نے ان کے سامنے اوپر والی حدیث کی وضاحت ایک دوسری حدیث کی روشنی میں کی کہ ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: 'أمرت أن أقاتل الناس علی ثلاث: شهادة أن لا اله إلا اللّٰه و إقام الصلٰوة و إيتاء الزكٰوة' (مجھے حکم ملا ہے کہ میں تین چیزوں پر لوگوں سے جنگ کروں: کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت پر، نماز قائم کرنے پر، زکوٰۃ کی ادائیگی پر)۔ پس اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں اس سے کم پر قناعت نہیں کروں گا۔ اگر یہ لوگ اس زکوٰۃ میں سے ایک جانور بھی روکیں گے جو رسول اللہ کو ادا کرتے رہے ہیں تو میں اس کے لیے بھی ان سے جنگ کروں گا، یہاں تک کہ اللہ جو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے، میرے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے۔ اگر میں ان لوگوں سے جنگ کرنے کے لیے کسی کو بھی نہ پاؤں گا تو ان سے تنہا جنگ کروں گا۔

ان کی اس وضاحت اور اس عزم بالجزم کے اظہار کے بعد لوگ مطمئن ہو گئے۔ بالآخر انھوں نے مانعین زکوٰۃ پر فوج کشی کی اور ان کو بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ لوگوں نے ان کے اس اقدام کو اس قدر پسند کیا کہ ابورجاء عطاردی بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ لوگ جمع ہیں اور حضرت عمر حضرت ابوبکر کا سر بار بار چومتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں آپ کے قربان جاؤں۔ اگر آپ نہ ہوتے تو ہم تو تباہ ہو گئے ہوتے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میں نے یہ سارا بیان ابن قتیبہ کی ''الامامۃ والسیاسۃ''* سے لیا ہے اور بغیر کسی تصرف کے اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔ اس کو پڑھنے اور اس پر غور کرنے سے چند حقیقتیں بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ یہ معاملہ شوریٰ اور امیر کے درمیان کا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کو شوریٰ کے سامنے پیش ہی نہیں کیا تھا۔ شوریٰ کے سامنے وہ مسائل پیش ہوتے ہیں جو اجتہاد اور امور مصلحت سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ یہ معاملہ دین کا ایک منصوص مسئلہ ہے۔ اسلامی حکومت میں کسی ایسی جماعت کے بہ حیثیت مسلم حقوق شہریت باقی نہیں رہتے جو بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دے۔ یہ چیز اسلامی قانون میں طے شدہ ہے۔ اس وجہ سے حضرت ابوبکر کی ذمہ داری یہ نہیں تھی کہ وہ اس کو شوریٰ کے سامنے رکھتے، بلکہ بہ حیثیت خلیفہ ان کی

---

* ۱۹/۱۔

ذمہ داری صرف یہ تھی کہ وہ اس بارے میں قانون کی تنفیذ کرتے۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ اسلامی حکومت کے حدود میں کوئی جماعت اگر قتل و غارت شروع کر دے تو خلیفہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اس جماعت کی سرکوبی کے لیے شوریٰ سے اجازت حاصل کرے، بلکہ اس کا فرض ہے کہ قرآن نے محاربین کے لیے جو قانون بتایا ہے،اس کی تنفیذ کے لیے اپنے اختیارات بے دھڑک استعمال کرے۔

دوسری یہ کہ جن لوگوں نے امیر کے اس اقدام سے متعلق تردد کا اظہار کیا، ان کو ایک حدیث کے سمجھنے میں غلط فہمی ہو رہی تھی۔ حضرت ابوبکر نے اس حدیث کے اجمال کو ایک دوسری حدیث سے، جو انھوں نے خود حضور سے سنی تھی، واضح کر دیا جس سے لوگ مطمئن ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں کے نزدیک اس حدیث سے زیادہ وقیع حدیث اور کون ہو سکتی تھی جس کے راوی خود حضرت ابوبکر صدیق ہوں۔

تیسری یہ کہ حضرت ابوبکر نے یہ جو فرمایا کہ اگر ان لوگوں سے لڑنے کے لیے میں کسی کو نہیں پاؤں گا تو میں تنہا ان سے لڑوں گا، یہ شوریٰ کے کسی فیصلہ کو ویٹو کرنے والی بات نہیں ہے، بلکہ یہ اس ذمہ داری کا صحیح صحیح اظہار و اعلان ہے جو دین کے واضح اور قطعی احکام کی تنفیذ اور ان کے اجرا سے متعلق بہ حیثیت خلیفہ ان پر عائد ہوتی تھی۔ اسلام میں خدا اور اس کے رسول کے احکام کی تنفیذ کے لیے خلیفہ کی اصل ذمہ داری یہی ہے کہ وہ ان کی تنفیذ کے لیے اپنی جان لڑا دے، اگرچہ ایک شخص بھی اس کا ساتھ نہ دے۔ جمہور کے مشوروں کا پابند وہ، جیسا کہ عرض کیا گیا، مصلحتی اور اجتہادی امور میں ہے، نہ کہ شریعت کی قطعیات میں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اسی طرح لشکر اسامہ کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی ساری تیاریاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضور کی حیات مبارک ہی میں ہو چکی تھیں۔ اس کے لیے اشخاص بھی حضور کے منتخب کردہ تھے۔ اس کے لیے جھنڈا بھی خود حضور نے باندھا تھا، یہاں تک کہ اگر حضور کی علالت نے تشویش انگیز شکل نہ اختیار کر لی ہوتی تو یہ لشکر روانہ ہو چکا ہوتا۔ اسی دوران میں حضور کا وصال ہو گیا اور حضور کے بعد حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے۔ انھوں نے خلیفہ ہونے کے بعد قدرتی طور پر اپنی سب سے بڑی ذمہ داری یہ سمجھی کہ حضور جس لشکر کے بھیجنے کی ساری تیاریاں اپنے سامنے کر چکے تھے اور جس کے جلد سے جلد بھیجنے کے دل سے آرزومند تھے، اس لشکر کو اس کی پیش نظر مہم پر روانہ کریں۔ بہ حیثیت خلیفۂ رسول ان کی سب سے بڑی ذمہ داری اور ان کے لیے سب سے بڑی سعادت اس وقت اگر کوئی ہو سکتی تھی تو بلاریب یہی ہو سکتی تھی کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کو پورا کریں۔ اس کام کے لیے وہ شوریٰ سے کسی مشورہ کے محتاج نہ تھے، کیونکہ اس لشکر کے بھیجنے کے فیصلہ سے متعلق سارے امور خود حضور کے سامنے، بلکہ حضور کے حکم سے طے پا چکے تھے۔ پیغمبر

کے خلیفہ کی حیثیت سے ان کا کام پیغمبر کے فیصلہ کو نافذ کرنا تھا نہ کہ اس کو بدل دینا۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے جب وقت کے مخصوص حالات کی بنا پر اس لشکر کی روانگی کو خلاف مصلحت قرار دیا تو انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جس جھنڈے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھا ہے، میں اس کو کھولنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

بہرحال، یہ دونوں واقعے کسی طرح بھی اس بات کی دلیل نہیں بن سکتے کہ خلیفہ کو شوریٰ کے فیصلے رد کر دینے کا حق ہے۔ یہ اگر دلیل ہیں تو اس بات کی دلیل ہیں کہ خدا اور رسول کے قطعی اور واضح احکام کی تنفیذ کے معاملہ میں خلیفہ شوریٰ سے مشورہ حاصل کرنے کا پابند نہیں ہے، بلکہ اس کی ذمہ داری صرف ان احکام کی تنفیذ ہے۔

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام میں شوریٰ متعین بھی ہے اور امیر اس کی اکثریت کے فیصلوں کا پابند بھی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں چونکہ تمام اہل الرائے، جیسا کہ عرض کیا گیا، مرکز میں مجتمع رہتے تھے، جماعتوں اور قبیلوں کے لیڈر وقت کے نظام معاشرت کے تقاضے کے تحت معین ہوتے تھے، نیز مملکت کا دائرہ بہت زیادہ وسیع نہ تھا، اس وجہ سے یہ شورائی نظام بہت سادہ اور بسیط قسم کا تھا۔ اس زمانہ میں حالات بہت مختلف ہیں، اس وجہ سے شوریٰ کو متعین کرنے کے لیے بعض ضروری اصلاحات کے ساتھ انتخابات کے جدید طریقوں کو اختیار کیا جا سکتا ہے اور شوریٰ اور امیر کے باہمی تعلقات کی تعیین کے لیے ضروری قوانین بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ ایسا کرنا اسلام کے منشا کے خلاف نہ ہوگا۔

(تفہیم دین ۱۲۶-۱۳۳)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

○

لایا ہوں پھر صبوحی پیمانۂ سخن میں
رندوں نے بڑھ کے لی ہے ہر بزم و انجمن میں

کیا کیا ہوئی ہے ظاہر ہر شے میں تیری قدرت
پھولوں کے رنگ و بو میں، تتلی کے پیرہن میں

سبزے میں، ندیوں میں، ہر کوہ، ہر دمن میں
صحرا کی وسعتوں میں، ہرنوں کے بانکپن میں

تیرا جمال دیکھا، تیرا کمال دیکھا
چڑیوں کے چہچہوں میں، انساں کے علم و فن میں

میرا وجود کیا ہے؟ مٹی کا ایک ذرہ
دہقاں نے بو دیا ہے خورشید کی کرن میں

دیکھیں اگر تو اب بھی اپنی تلاش میں ہے
وہ شے کہ پھونک دی ہے تو نے ہر اک بدن میں

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تہمت کی عمر کیا ہے، چھٹ جائیں گے یہ بادل
رہتا ہے دو گھڑی تک مہتاب بھی گہن میں

اے عندلیب، پھر وہ نغمے کہ پے بہ پے ہوں
فصل بہار آئی کاشانۂ چمن میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نعیم احمد

اشاریہ ماہنامہ ''اشراق'' ۲۰۱۵ء

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قرآنیات

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	البیان: یوسف ۱۲: ۵۴-۱۰۱ (۴)	جاوید احمد غامدی	۷
فروری	البیان: یوسف ۱۲: ۱۰۲-۱۱۱ (۵)	"	۵
مارچ	البیان: الرعد ۱۳: ۱-۱۳ (۱)	"	۵
اپریل	البیان: الرعد ۱۳: ۱۴-۱۶ (۲)	"	۵
مئی	البیان: الرعد ۱۳: ۱۷-۲۶ (۳)	"	۵
جون	البیان: الرعد ۱۳: ۲۷-۴۳ (۴)	"	۵
جولائی	البیان: ابراہیم ۱۴: ۱-۴ (۱)	"	۵
اگست	البیان: ابراہیم ۱۴: ۵-۲۷ (۲)	"	۵
ستمبر	البیان: ابراہیم ۱۴: ۲۸-۵۲ (۳)	"	۵
اکتوبر	البیان: الحجر ۱۵: ۱-۲۵ (۱)	"	۷
نومبر	البیان: الحجر ۱۵: ۲۶-۴۸ (۲)	"	۵
دسمبر	البیان: الحجر ۱۵: ۴۹-۷۷ (۳)	"	۵

معارف نبوی

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	انصاری خواتین کی بیعت	معز امجد/ شاہد رضا	۲۵
فروری	سوال سے احتراز کے بارے میں روایات	امین احسن اصلاحی	۹
؍	انصاری خواتین کی بیعت اسلام	معز امجد/ شاہد رضا	۱۶
مارچ	کیا باتیں ہیں جو مکروہ ہیں	امین احسن اصلاحی	۱۳
اپریل	اللہ کے ذکر کے بغیر کہی ہوئی بات کا ناپسندیدہ ہونا	؍	۷
؍	سیدنا صدیق اکبر...معیت خداوندی ونبوی	شاہد رضا	۱۰
مئی	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خیر وشر	معز امجد/ شاہد رضا	۹
جون	فضائل رمضان	محمد رفیع مفتی	۱۳
؍	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی	معز امجد/ شاہد رضا	۱۶
جولائی	لیلۃ القدر کا قیام ایمان میں سے ہے	امین احسن اصلاحی	۹
؍	طاق راتوں کی نماز	معز امجد/ شاہد رضا	۱۲
اگست	غیبت کے بارے میں حکم	امین احسن اصلاحی	۱۵
ستمبر	نظم اجتماعی کے متعلق پانچ احکام	معز امجد/ شاہد رضا	۱۳
اکتوبر	نیکی میں تعاون	؍	۱۲
نومبر	اچھائی اور برائی کی ابتدا کرنے کا صلہ	؍	۱۱
دسمبر	اچھائی کی دعوت کا اجر	؍	۱۱

اس شمارے میں

جنوری	اس شمارے میں	نعیم احمد	۴
فروری	اس شمارے میں	؍	۴
مارچ	اس شمارے میں	؍	۴

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

صفحہ	مصنف	عنوان	شمارہ
۴	نعیم احمد	اس شمارے میں	اپریل
۴	″	اس شمارے میں	مئی
۴	″	اس شمارے میں	جون
۴	″	اس شمارے میں	جولائی
۴	″	اس شمارے میں	اگست
۴	″	اس شمارے میں	ستمبر
۴	″	اس شمارے میں	اکتوبر
۴	″	اس شمارے میں	نومبر
۴	″	اس شمارے میں	دسمبر

دین و دانش

۲۴	امین احسن اصلاحی	روزہ اور برکات روزہ	جون
۳۳	جاوید احمد غامدی	روزہ	″
۳۶	شاہد رضا	روزہ اور تزکیۂ نفس	″
۱۵	امین احسن اصلاحی	آفات روزہ اور ان کا علاج	جولائی
۲۱	خورشید احمد ندیم	خلع اور تنسیخ نکاح	″
۲۰	جاوید احمد غامدی	حج و عمرہ	ستمبر
۲۸	″	قربانی	″

نقطۂ نظر

۳۹	رضوان اللہ	بعد از موت (۵)	جنوری
۳۷	″	نوح کا بیٹا	مارچ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جولائی	بعدازموت(۶)	رضوان اللہ	۴۰
اگست	اسلام اور خلافت	ریحان احمد یوسفی	۲۷
؍	بعدازموت(۷)	رضوان اللہ	۴۰
ستمبر	بعدازموت(۸)	؍	۴۰
؍	شہید کی تعریف	ڈاکٹر خالد ظہیر / رانا معظم صفدر	۴۵
اکتوبر	بعدازموت(۹)	رضوان اللہ	۳۳
؍	پولیو ویکسینیشن مہم سے دشمنی	ڈاکٹر خالد ظہیر / رانا معظم صفدر	۳۹
نومبر	سید احمد شہید کا تبلیغی، جہادی اور اصلاحی کردار: ایک تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر عرفان شہزاد	۳۴
؍	تعدد ازواج کی آیت کا مطالعہ(۱)	رضوان اللہ	۴۲
دسمبر	تعدد ازواج کی آیت کا مطالعہ(۲)	؍	۲۵
؍	کیا مغرب مسلمانوں کے لیے دارالحرب ہے؟	ڈاکٹر خالد ظہیر / رانا معظم صفدر	۳۲

نقد و نظر

اپریل	جوابی بیانیوں کا پس و پیش	ساجد حمید	۳۶

سیر و سوانح

جنوری	حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ(۱)	محمد وسیم اختر مفتی	۳۲
فروری	حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ(۲)	؍	۲۸
مارچ	حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ(۳)	؍	۱۹

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
اپریل	حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ (۴)	محمد وسیم اختر مفتی	۲۱
مئی	حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ (۱)	؍؍	۲۷
جون	حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ (۲)	؍؍	۴۱
جولائی	حضرت سہیل بن بیضا رضی اللہ عنہ	؍؍	۲۶
اگست	حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ (۱)	؍؍	۲۰
ستمبر	حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ (۲)	؍؍	۳۵
اکتوبر	حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ (۳)	؍؍	۲۸
نومبر	حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ (۴)	؍؍	۲۴
دسمبر	حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ	؍؍	۱۷

مقامات

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	قراءت کا اختلاف	جاوید احمد غامدی	۲۷
فروری	اسلام اور ریاست — ایک جوابی بیانیہ	؍؍	۲۰
مارچ	قانون کی بنیاد	؍؍	۱۶
اپریل	ریاست اور حکومت	؍؍	۱۷
مئی	خلافت	؍؍	۲۳
جون	اسلام اور قومیت	؍؍	۳۸
جولائی	پارلیمنٹ کی بالادستی	؍؍	۲۴
اگست	شریعت کی سزائیں	؍؍	۱۷
ستمبر	ازواج مطہرات	؍؍	۳۰
اکتوبر	مسلم اور غیر مسلم	؍؍	۱۸
نومبر	دین کا ماخذ	؍؍	۲۱

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مقالات

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
فروری	حکیم کا طرز فکر و تعلیم	امام حمید الدین فراہی	۳۶
؍	تدبر قرآن سے البیان تک	خورشید احمد ندیم	۴۶
مارچ	نظم قرآن	امین احسن اصلاحی	۲۷
اپریل	سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر	شبلی نعمانی	۲۹
مئی	آیت بسم اللہ	امام حمید الدین فراہی	۳۵
جولائی	علوم القرآن	شبلی نعمانی	۳۳
اکتوبر	مذاہب پر غور کا طریقہ	امام حمید الدین فراہی	۲۰
؍	شیعہ سنی فسادات کا مسئلہ	امین احسن اصلاحی	۲۵

یسئلون

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	مجتہدین، اجتہاد اور اجماع	امین احسن اصلاحی	۴۶
مارچ	حضرت ابوہریرہ کی روایت حدیث اور حضرت عمر	؍	۴۷
اپریل	حکومت اسلامی کے قیام کی شرط اول	؍	۴۱
مئی	عقائد و عبادات کا تعلق تعمیر سیرت سے	؍	۴۵
اکتوبر	غلاف کعبہ کی شرعی حیثیت اور اس کی تعظیم کے حدود	؍	۴۳
؍	حروف مقطعات پر تشدید	رضوان اللہ	۴۸
دسمبر	شوریٰ سے متعلق دو اہم سوال	امین احسن اصلاحی	۳۵

وفیات

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
اپریل	مولانا ابوالکلام آزاد	امین احسن اصلاحی	۴۶
مئی	علامہ عنایت اللہ خان مشرقی	؍	۴۸

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ادبیات

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	غزل	جاوید احمد غامدی	۴۹
فروری	غزل	〃	۴۹
مارچ	غزل	〃	۴۹
اپریل	غزل	〃	۴۹
مئی	غزل	〃	۵۰
جون	غزل	〃	۴۹
جولائی	غزل	〃	۴۹
اگست	غزل	〃	۴۹
ستمبر	غزل	〃	۴۹
اکتوبر	غزل	〃	۴۹
نومبر	تلقین صبر	میر ببر علی انیس	۴۹
دسمبر	غزل	جاوید احمد غامدی	۴۲

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org